جمیلہ ہاشمی

آتش رفتہ

سلسلہ پوتھی ادب

قیمت

ا روپیہ ۲۵ پیسے

(صرف ماشیل داستان گو لتھو شاپ میں چھپا)

(جملہ حقوق بہ حق ناشر محفوظ)

اگست ۱۹۶۱ء

ہندوستان میں :۔
جملہ حقوق کے محافظ نمایندہ
جناب خوشتر گرامی
ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی

بار اول
تعداد :۔ ایک ہزار
ناشر :۔ داستان گو پبلشرز، دی مال، لاہور
طابع :۔ اشرف پریس، لاہور

آتشِ رفتہ

جمیلہ ہاشمی

داستان گو پبلشرز — دی مال — لاہور

نیلی دُھوڑ

پوہ کی لمبی رات بیتی جا رہی ہے۔ کہیں دور کسی گھڑیال نے بارہ بجائے ہیں۔ مگر بلونت کی موٹر کا ہارن نہیں بجا۔ پھاٹک کھلنے کی آواز نہیں آئی۔ جب وہ باہر سے آتا ہے تو موٹر کی روشنی اس ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سیدھی میرے پلنگ پر پڑتی ہے۔ جیسے سرد ہوا تیر کی طرح یہاں میرے منہ پہ آ کر لگ رہی ہے۔ اس ریشمی رضائی میں کتنی ٹھنڈ لگتی ہے۔ ریشم تو بس بہو بیٹیوں کے پہننے کے لائق ہوتا ہے۔ اس کی رضائی میں ساری رات ٹھنڈ سے جسم اکڑتا رہتا ہے۔ مگر امیت کہتی ہے "نہیں باپو آپ یہی رضائی لیا کریں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ کتنے جاہل ہیں یہ لوگ جو کھدر کی رضائی اوڑھتے ہیں۔" تو مجھے ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ گھر میرا نہیں بلونت سنگھ کا ہے۔ اور میں اس کے گھر میں رہ کر بہو کا دل میلا نہیں کر سکتا! ویسے بھی نہ جانے اب نیند کیوں نہیں آتی۔ ساری رات یونہی بیت جاتی ہے۔ اور نہ جانے وہ زمانہ کیوں بار بار دل میں لوٹ آتا ہے۔ جو اصل میں لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کبھی ایک بات اور کبھی دوسری، یادوں

کے دیئے سے لمبی اور ٹھنڈی اندھیری راتوں میں جل اٹھتے ہیں۔ جب بیتے دن لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں تو پھر بیتی باتیں کیوں یونہی دل کو کبھی اتنا سرد کر دیتی ہیں اور کبھی اتنا گرم جیسے وہ جوش رگوں میں واپس آگیا ہو۔ جب ذرا ذرا سی بات پہ چھری چل جاتی تھی اور کہ باتیں نکل آتی تھیں۔ پھر بدلتی رتوں کے ساتھ دل کو وہی باتیں کیوں پیاری رہتی ہیں جو کبھی پیاری تھیں۔ نہ جانے کیوں؟ اس ٹوٹے شیشے میں سے پوہ کی رات کے سہانے تارے آنکھیں جھپکاتے نظر آ رہے ہیں۔ کیسی سندر رات ہے۔ سپنے جگانے والی۔ پھر میرے سپنے تو بہت دن ہوئے سو چکے ہیں۔ اب وہ وقت بھی کیوں یاد آتا ہے۔ جب میں نے سپنے دیکھے تھے اصل میں میں نے دادی سے وہ کہانی سننے کے بعد ہی سپنے دیکھنے شروع کئے تھے۔

پوہ کی ایسی ہی رات تھی ......

حویلی والے پیپل کے پتے ہوا کے زور سے شائیں شائیں کر رہے تھے۔ الّو بول رہے تھے اور خالی گلیوں میں تیز ہوا کے زور سے سوکھے پتوں کے اڑنے کی آوازیں ہمیں اپنی کوٹھڑی میں سنائی دیتی تھی۔ میں اور جنتی دادی کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ اور ڈر کے مارے گھڑی گھڑی اور زور سے دادی کو پکڑ لیتے تھے۔ کوٹھڑی میں دیا نہ تھا۔ اور گھور اندھیارے میں ہمیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ دروازے کے باہر یوں لگتا تھا جیسے کوئی رو رو کر بین کر کے منتیں کرتے ہوئے دروازے کھولنے کو کہہ رہا ہو۔ کواڑوں پر ہوا اس زور سے آن کر لگتی تھی اور کواڑ تالوں پہ یوں چرچراتے تھے مانو ابھی کھل جائیں گے! میں نے ڈر کر کہا تھا۔ ”دادی دروازہ کون کھول رہا ہے“

اور دادی نے کہا تھا " کوئی نہیں بھاؤ چپ کر کے سو جا۔ اس طرح پوچھنے سے تو دیو جن آ جاتے ہیں۔ ہے واہ گرو تو خیر کریں۔ سچے پادشاہ، کس زور کی آندھی ہے۔ آج تو ٹلے کی باری پانی لگانے کی ہے بیچارا میرا اکیلا پوت ہے، لوگوں کے تو دو دو چار چار بھائی ہوتے ہیں۔ اس بیچارے کا کوئی ڈنڈی جتنا سہارا دینے والا بھی نہیں۔ میں اوگن ہاری بیچاری اس کی ماں ہوں، میرے پہ رحم کر، ہے واہ گرو!"

دوسری کوٹھڑی میں میری ماں اور گاؤں کی اور لڑکیاں چرخے کاتتی گیت گا رہی تھیں۔ اور تل چاول کھا رہی تھیں۔ سونے سے پہلے ماں نے مجھے اور جنتی کو تل چاول دیئے تھے۔ اور پیار کر کے کہا تھا کہ جاؤ دادی کے ساتھ سو جاؤ۔ میں نے ضد کی تو ماں نے مجھے گڑ کی بنی ہوئی پنیاں دیں۔ جن میں چاولوں کا آٹا ہوتا ہے۔ پھر ماں نے دادی سے کہا تھا " ماں جی آپ آج جنتی کے ساتھ لے بھی اپنے ساتھ سلائیں آج بہت سردی ہے اور ہمارے پرشاموں کی لڑکیاں سوئی ہوئی ہیں"

دادی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ میری دادی بہت بد مزاج عورت تھی۔ سارا گاؤں اس سے ڈرتا تھا۔ چھوٹی سی کرپان اپنے پاس رکھتی۔ اور ماجھے کے اس علاقے میں جہاں دن کو بھی اکیلی عورتیں ایک سے دوسرے گاؤں نہ جا سکتی تھیں۔ وہ رات کے سمے اکیلی چلی جاتی۔ حویلی گاؤں سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اور دور تک پھیلے ہوئے ہمارے کھیت اس سے بھی دور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی اکیلا حویلی سے پرے جب کبھی آدھے والے کھوہ پر گیا ہوں، مجھے چھوٹی نہر کے پاس آموں کے باغ سے بہت ہول آتا ہے۔

وہاں دن کو بھی اگر کوئی ڈاکو چھپ کر بیٹھ جائے تو کسی کو پتہ نہ چلے۔ درخت اتنے گھنے ہیں اور رات کی طرح کا اندھیرا سارا وقت چھایا رہتا ہے۔ جن دنوں آموں پہ بُور آتا ہے۔ تو اس اندھیرے باغ میں کوئلیں کوُ ہو کوُ ہو بولتی رہتی ہیں۔ میرا دل کوئل کی بولی سن کر نہ جانے کیوں ڈول جاتا ہے۔ جیسے ناؤ پانی پہ ہچکولے کھانے لگے۔ پھر گاؤں کے لڑکے باغ کے رکھوالے باغ میں کھیلنے اور حفاظت کرنے کے لئے وہاں آتے ہیں۔ اور دو مہینے رونق جمی رہتی ہے۔ رونق کی طرح وہ خوشبو جو گاؤں میں باغ پہ کھیتوں میں ہر جگہ اڑتی ہے۔ اناج اور آموں کی خوشبو مل کر شراب کا سا نشہ پیدا کرتی ہے۔ یہاں شہر میں پھولوں کی خوشبو ہے۔ بونت کی کوٹھی میں اتنے پھول ہیں۔ ہرے نیلے پیلے لال گلابی، اور یوں پھیلے ہوئے جیسے مسیا کے میلے میں ہنستی کھڑکھڑ کرتی مٹیاریں۔

دادی بدمزاج تھی تو کیا، انہیں بہت چاہتی تھی۔ میں تو اس کا بہت لاڈلا تھا۔ ماں کہا کرتی تھی یہ تو دادی کے لاڈ سے بگڑا ہوا ہے۔ اور پھر دادی ماں سے کہتی "کمزور نیتے تو تو ایسے ہی بچے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس عمر میں سارے بچے ہی ضد کرتے ہیں۔ ایسی ایسی ضدیں کہ واہ گرو یاد آ جاتا ہے۔ یہ ننھا منا بھولا بچہ ہے اگر تجھ سے کھیر کھانے کی یا گڑ مانگنے کی ضد کرے تو کیوں اتنا تھوڑا دل ہے تیرا، ماؤں کا دل تو دریا ہونا چاہیئے۔"

میں ضدیں بھی تو الٹی الٹی کرتا تھا، ماں چکی پیس رہی ہے، اسے روٹی لے کر کھیتوں پر جانا ہے۔ اور میں پاس بیٹھا کہہ رہا ہوں۔ "میں چکی میں دانے ڈالوں گا۔" اگر دودھ بلو رہی ہے تو میں کہتا اٹھ ماں پیڑھی پہ بیٹھنے دے"

کبھی کبھار وہ ایک آدھا چانٹا بھی جڑ دیتی۔ میں روتا ہوا دادی کے پاس جاتا، پھر دادی باہر آ دھمکتی، بکھن گرم کرتی یا کپاس بیلتی ماں کو گالیاں دیتی رہتی۔ اور لے جاتی۔ مگر میں نے کبھی اُس سے یہ ضد نہیں کی تھی۔ کہ میں بیلنے میں کپاس دونگا۔ مجھے ان جانے ہی اس سے خوف آتا تھا۔ جتنا وہ مجھے پیار کرتی اتنا ہی میں اس سے زیادہ ڈرتا تھا۔

چنتی سے اسے ذرا بھی پیار نہ تھا۔

اُس پوہ کی رات جب میں ڈر کر دادی سے کہانی کی فرمائش کرنے لگا تو دوسری طرف چنتی بھی دادی کے پیچھے پڑ گئی۔ مگر دادی نے اُسے کہا "چل لڑکی چپ کر کے سو جا۔ دیکھ باہر کس زور کی ہوا چل رہی ہے، اور تجھے کہانی کی پڑی ہے" اور میں دل ہی دل میں حیران بھی تھا اور خوش بھی، کہ دادی نے چنتی کو تو پھٹکارا ہے۔ اور مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بچپن کے ان دنوں میں دل کیسی کیسی باتوں سے خوش ہوتا ہے، پر کی طرح ہلکا ہو کر ہوا کے ساتھ اڑتا معلوم دیتا ہے۔ ان دنوں دکھ اور سکھ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ جلتی دوپہروں میں ننگے پاؤں میلوں چلنے کے بعد بھی پاؤں نہیں جلتے اور ذرا سے انگارے کا انگلی سے لگ جانا رونے دھونے اور ضد کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بھولے بھولے کون سی طاقتیں ہوتی ہیں۔ جو انسان کو لوہے کی طرح سخت اور مضبوط کر دیتی ہیں۔ پھر بڑے بڑے دکھ برداشت کرنے کی طاقت نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے۔ اور دادی سے سنی ہوئی پوہ کی راتوں میں اندھیرے اُجالے کی کہانیاں ساری زندگی پر یوں پھیل

جاتی ہیں۔ جیسے بڑ کی داڑھیاں اپنے گرد کی زمین پر دبے پاؤں قبضہ کر لیتی ہیں۔

میں نے دادی سے ضد کرنی شروع کی۔ دوسری کوٹھڑی سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اور چرخے کی گھوں گھوں میں گھلے ہوئے گیت جو کبھی کبھی ہوا میں یونہی میرے آس پاس اڑتے ہوئے جاتے ہیں۔ اور پھر میں آنکھیں اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوں وہ کوٹھڑی کہاں ہے وہ گاؤں کدھر ہے وہ پرانی زندگی گیت کا بول تھا۔ جو مجھے اس کوٹھڑی میں سنائی نہیں دیتا اور تیز چلتی ہوا کے ساتھ کبھی دور ہو جاتا ہے اور کبھی مدھم مدھم کان میں پڑتا ہے۔ جیسے رہٹ کی رُوں رُوں۔

اس رات دادی بہت چُپ سی تھی۔ جیسے اداس ہو۔ اُس دن اس نے ماں کو اتنی گالیاں دی تھیں کہ ماں ہمسایوں کے گھر جا کر رو پڑی تھی۔ اور دادی نے جب سنا تھا تو جا کر اُسے چوٹی سے گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر لے آئی تھی۔ ماں ہولے ہولے رو رہی تھی۔ اور آنسو پونچھ رہی تھی۔ اندر باہر پھرتی کام کر رہی تھی پھر اس نے روٹی پکا کر لسّی کا برتن اٹھایا تھا اور سر پہ رکھ کر آنگن سے باہر چلی گئی تھی۔ دادی نے جاتے جاتے اُسے کہا تھا "کُڑیئے جلدی واپس آ جانا مجھے ذرا کانیاں جانا ہے۔ میں نے سنا ہے۔ چانن سنگھ بیمار ہے۔" اور میری ماں نے یوں جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو کہا تھا۔ "کیوں ماں کیا بات ہے ماما کب سے بیمار ہے تو نے تو ہمیں بتایا نہیں اُتے کو بھی ساتھ لے جا۔"

دادی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا۔ "اُتے کو تو اکیلے تنے کام کرنے ہیں۔ اپنے ویر کو میں اکیلی ہی دیکھ آؤں گی۔ بس تُو ذرا جلدی واپس آ جا۔ اور دیکھ یہ کپاس پڑی ہے۔ اس کو اندر کوٹھی میں رکھ دے میں آ کر خود

ہی پیل لوں گی۔"

اُتم سنگھ میرے باپ کا نام تھا۔

گہرے کالے بادل فوجوں کی طرح چڑھے آتے تھے ہوا بہت زوروں سے چل رہی تھی۔ اور درخت جھک جھک جاتے تھے۔ جب دادی گھر واپس آئی۔ اس نے ہاتھ میں جوتی پکڑ رکھی تھی۔ اور ننگے پاؤں پہ گرد جمی ہوئی تھی۔ جس کو جھاڑ کر اس نے کہا "وہ کرڑ پیے کو ٹھے پر سے اُپلے اتار لا۔ لا مجھے ٹوکری دے نہ جانے بھڑی کتنے دنوں کی ہو۔ سیلی لکڑیوں سے نہ چولہا جلتا ہے اور نہ ہی تنور۔"

ماں نے پوچھا۔ "ماسے کا کیا حال تھا۔"

"اچھا تھا" دادی نے مختصر جواب دیا اور پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی "حکیم جی بھی یہاں نہیں ہیں۔ سنا ہے کہ انتقے کام نہ ہوتے تو اسے فرزن کھیڑے بھیجتی۔ مگر وہ اکیلا ہے اپنے کام ہی پورے نہیں کر سکتا۔"

اور میری ماں نے کہا "آخر ساری دنیا ہی اکیلی ہوتی ہے۔ سارے کام ہی کرتے ہوتے ہیں۔ تو نے اُتمے کے اکیلے ہونے کو کہانی بنا لیا ہے۔ پڑوس میں چیت سنگھ اکیلا ہے۔ تیرا اپنا بھائی جانن سنگھ اکیلا ہے۔ میرا باپ اکیلا تھا۔ گاؤں میں کتنے لوگ ہیں جو ایسے ہی بوتے گاہتے کا کام بھی کرتے ہیں دید حکیموں کے پاس جاتے ہیں۔ رشتے داروں کی خیر خبر بھی رکھتے ہیں۔ تو نے اُسے کیا ہتھیلی کا پھوڑا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اگر ماسے کی بیماری پہ وہ ذرا جا کر فرزن کھیڑے سے دید جی کا پتہ کر آئے تو کیا ہو جائے گا۔"

اور دادی نے کہا، "چپ کر کرمٹیے، واہ گرو بھلا کرے تو تو چپ ہی نہیں کرتی، ہونا کیا ہے؟ میرے پُوت کو کیوں کچھ ہو۔ میں جو ہوں جا کر سویرے وید جی کا پتہ کر آؤں گی آپ ہی۔ تو کیوں بولتی ہے وزن کھیڑے کونسا سو کوس ہے؟"

ماں نے کہا، "پر تُو ماسے کو بیمار چھوڑ کر کیوں آ گئی تھی۔ گھر کو کوئی سر پہ تو نہ اٹھا کر لے جاتا۔ دیکھ تو سہی، کتنے کالے بادل آئے ہیں۔ اب اگر جھڑی لگ گئی تو سویرے تُو کس طرح وزن کھیڑے جائے گی۔ میں اُنہی کو کہوں گی وہ روٹی کھانے تو گھر آئے گا نا۔"

دادی نے جیسے زندگی میں پہلی بار ہتھیار ڈالے ہوں۔ چپ ہو رہی اور جب باپو روٹی کھانے گھر آیا تو اس نے یہ سنکر کہ ماما بیمار ہے اسی وقت گھوڑے کو باہر نکال لیا۔ مگر ہوا بہت تیز تھی۔ اور دادی نے بڑی سختی سے کہا۔

"اتم سنگھ۔ بہو کا تو دماغ چل گیا ہے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے وزن کھیڑے جانے کا۔ ایسے میں تو میں تجھے کبھی نہیں جانے دونگی۔ چاہے کچھ ہو۔ رات کو تجھے کھیتوں کو پانی بھی لگانا ہے نہ بھاؤ۔ میں سویرے آپ ہی چلی جاؤں گی۔ ویر میرا بیمار ہے۔ اور پھر راہ اس قدر خراب ہے۔ پیاری ونڈ کے پاس سے تو رات کے وقت مڑھیں ہوتیں میں نہیں گزری۔ نہ بھاؤ میں نے تجھے نہیں جانے دینا۔"

باپو نے بھی ضد نہ کی۔ وہ گھوڑے کو حویلی لے گیا اور درختوں کے پتے اس کے پیچھے گلیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔

پرہ کی رات میں نے دادی سے کہانی سنانے کی ضد کی تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، "کاکا کہانیاں تو مجھے بہت یاد ہیں پر ساری کہانیاں ـــ

آپس میں مل گئی ہیں۔ گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کون کہانی کس جگہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں ختم ہو گئی۔ سوت کی انٹی میں پڑی گرہوں کی طرح ساری کہانیوں کے تاگے ایک دوسرے سے الجھ گئے ہیں۔"

اور چنتی نے بھولے پن سے کہا "دادی تیرا ایٹرن مجھے پتہ ہے۔ کہاں پڑا ہے میں اندھیرے میں بھی ٹٹول کر اسے لا سکتی ہوں۔ کیوں دادی میں تجھے ایٹرن لا دوں۔"

دادی نے بہت ہولے سے ٹھنڈی سانس بھری یا یہ میرا وہم ہے ان دنوں ٹھنڈی سانسوں کا کیا پتہ تھا۔ پوہ کی راتوں میں دادی اور ماں کے ساتھ چمٹ کر سونے سے تو سردی کا بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ مگر وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس نے چنتی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر میں نے کہا "دادی کہانی سنا نہیں تو میں نے تیرے ساتھ نہیں بولنا"

چنتی نے کہا۔ "دادی کہانی سنا نہیں تو میں نے تیرے ساتھ نہیں بولنا۔ دادی وہ بادشاہ کی بات تو تجھے یاد ہو گی نا، جس کے سات بیٹے تھے اور جو پھول شہزادی کی تلاش میں گئے تھے اور پتھر ہو گئے تھے۔"

دادی نے ہولے ہولے کہا "آج میں ایک سچی کہانی سناتی ہوں۔ پر کہانی بڑی لمبی ہے۔ بہت ہی لمبی! اگر تم سو گئے تو پھر میں کبھی بھی نہیں سناؤں گی۔ کبھی نہیں" اس نے رضائی ہمارے گرد لپیٹ دی۔ آج رضائی اپنے گرد لپیٹتا ہوں تو بھی ٹھنڈ نہیں رکتی۔ سامنے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے جو تارے دکھائی دیتے ہیں وہ پتھر کے لگتے ہیں۔ آسمان کی نیلاہٹ میں ایک پیلاہٹ

ہے چاند نکلا ہوگا۔ کہتے ہیں۔ سردیوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی یونہی بیت جاتی ہے۔ جب پوہ کی ٹھنڈی راتوں میں ہم پانی لگاتے تھے۔ تو خون آپ سے آپ گرم ہو جاتا تھا۔ اور بہتے پانی کے ساتھ دل کس طرح سے ناچتا تھا۔ پھر ہیں اور دیہو درختوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ مجھے آسمان کی نیلاہٹ میں سے اترا ہوا چاند کا ایک ٹکڑا لگتی تھی اس کی آنکھیں سیاہ رات کی سی کالی تھیں۔ اور اس کے گرد ایسی ہی خوشبو ہوتی تھی جیسے اناج کے کھیت اور آموں کے بور سے نکلتی ہے۔ ننگے پاؤں صرف ایک کرتا پہنے اور سر پہ کھدر کی موٹی سرخ رنگ کی چنری اوڑھے نہ جانے وہ اتنی دور کیسے آیا کرتی تھی۔ پوہ کی لمبی تاریک اور سرد راتوں میں اسے کھیتوں کی طرف آتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ پر میں بھی کیسی کیسی باتیں سوچنے لگا ہوں اگر اس رات مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کہانیاں نہ کسی اور کی ہیں نہ کہیں سے آئی ہیں۔ کسی شہزادے اور راجے مہاراجے کسی سور بیر کی نہیں ہماری اپنی ہیں جو ہمارے خون میں پلتی بڑھتی ہیں۔ اور پھر آکاس بیل کی طرح ہمارے ہی جسموں کی گرمی سے ہری بھری رہتی ہیں۔ تو میں دادی سے بہت کچھ پوچھتا مگر دادی تو سچی کہانی سنا رہی تھی۔ اور ہم بچے تھے جو اس کی بات سنتے بنا سہ گئے تھے۔ اس رات یوں لگتا تھا جیسے ساری رات میں کہانی سنتا رہا تھا۔

دادی نے اور راتوں کی طرح اس رات کہانی یوں نہیں شروع کی تھی۔ یہ تمہارا ہمارا خدا بادشاہ، کسی دور کے دیس کی بات ہے وہاں ایک راجہ تھا جس کی سات رانیاں تھیں۔ ساتوں کے مکھ جیسے بھور ہو۔ پر ساتویں

سب سے چھوٹی رانی سب سے سندر تھی۔ بڑی چنچل ہوا کی طرح اسے چین نہ تھا۔ سارے راج بھون میں کاتی پھرتی جیسے چڑیا ہو۔" چھوٹی رانی کہانیوں میں سب سے سندر ہوتی ہے اور پیاری، راجہ کو سب سے زیادہ اچھی لگنے والی اور اس لئے راجہ اس کی بات بہت مانتا ہے۔

دادی نے جو کہانی سنائی اس میں کوئی راجہ نہ تھا، کوئی رانی نہ تھی۔ پرانوپ سنگھ کو بھاگو بہت اچھی لگتی تھی۔ اور پھر بھی وہ اس کی کچھ نہ تھی۔ رانی ہونا بڑی بات ہے وہ تو ہمارے تمہارے گھروں میں کام کرنے والی کہاری تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ دادی نے اس کے کہاری ہونے پر بڑا زور دیا تھا۔ اس رات کھدر کی سرخ رنگ کے چھاپ سے ڈھپنی رضائی میں دادی کے ساتھ لیٹا میں سوچ رہا تھا۔ ایشر سنگھ بھی کہار ہے اور اس کی چندھی آنکھوں والی بیوی سنتو تو ذرا بھی اچھی نہیں۔ کیا چپ چپ آنکھوں سے سارا وقت پانی بہتا ہے۔ اگر بھاگو اس طرح کی ہوتی تو انوپ سنگھ کو کیا اچھی لگی ہوگی۔ وہ دن بیت گئے بہت پیچھے رہ گئے۔ آج مجھے معلوم ہے کہ اچھا لگنے کے لئے آنکھوں کی سیاہی اور رانیوں کی سی چال کچھ نہیں کرتی۔ جو عورت اچھی لگنے لگی اس میں یہ ساری باتیں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔

"انوپ سنگھ کی ایک عورت تھی جس کے ساتھ گونتھ کے سامنے اس کا بیاہ ہوا تھا۔ پر وہ سارا وقت اس سے غصے رہتا۔ نہ بولتا اور نہ اچھا سلوک کرتا۔ گھر آتا تو یونہی بات بے بات اسے مارتا رہتا۔ اس کے اچھے کپڑے گہنے تک اس سے چھین کر لے گیا۔ اور پوچھنے پر کہنے لگا میں نے کسی کا قرض دینا

تھا۔ بیچ دیتے ہیں۔" عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ ہر دکھ چپ چاپ سہہ لیتی ہے پر یہ نہیں سہہ سکتی۔ کہ اس کا مرد کسی دوسری عورت سے اچھا سلوک کرے اور اس کے گہنے لے جا کر اسے دیا کرے۔"

جنتی نے تب آدھی سوئی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "کیوں دادی جو انوپ سنگھ کو اچھی لگتی تھی۔ اسے ہی تو وہ کپڑے لے جا کر دیتا تھا۔ اگر وہ اس طرح نہ کرتا تو کیسے پتہ چلتا کہ وہ اسے اچھی لگتی بھی ہے کہ نہیں۔"

دادی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"انوپ سنگھ نے اب گھر سے بھی باہر رہنا شروع کر دیا۔ سارے گاؤں میں بھاگو اور انوپ کی باتیں ہوتیں۔ پر وہ پڑا اکھڑ تھا۔ کسی کی نہ سنتا اور نہ کسی کی پرواہ کرتا۔"

میں نے پوچھا "کیوں دادی انوپ سنگھ کوئی راجہ تھا جو کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔"

دادی نے کہا "نہیں راجہ تو نہیں تھا۔ پر پھر بھی کسی کی نہ سنتا اور نہ ہی بھاگو سے ملنے سے باز آتا۔ ہر رات وہ دونوں کہیں نہ کہیں ضرور ملتے۔ کبھی کھیتوں میں کبھی باجرے میں۔ کبھی مندر کے پچھواڑے۔ انوپ تو آدمی تھا مگر بھاگو کو ذرا شرم نہ آتی تھی۔"

"کیوں دادی کسی آدمی سے ملنا بری بات ہوتی ہے۔" جنتی نے بھولے سے پوچھا۔

— ہوتے ہوتے رتیں بدلتی گئیں سال بیتتے رہے اور انوپ سنگھ کا لڑکا

بڑا ہونے لگا۔

مجھے نیند آنے لگی تھی۔ چنتی تو کبھی سو چکی تھی۔ دادی بیوپار کئے بنا کہ ہم ہونکارے نہیں بھرتے مسلسل کہانی جاری تھی۔ اس کی آواز کبھی تو چرخے کی گھوں گھوں میں کھو جاتی۔ کبھی ماں اور اس کی سہیلیوں کے گیتوں میں اور کبھی دروازے کے باہر شور مچاتی ہوا اور دروازے کی چڑ چڑاہٹ میں۔ اور جب بھی اس کی آواز ان ساری آوازوں سے اونچی ہوتی تو مجھے سمجھ نہ آتی کہ کہانی کس کی ہے۔ میں نے نیند میں سنا جیسے خواب سے رہا ہوں۔ دادی کہہ رہی تھی "اور پھر گھوڑی پر سوار ہو کر انوپ سنگھ کا بیٹا دونوں کے پیچھے پیچھے گیا۔ گھوڑی بڑی جوان تھی اور اُتنے جیسا جوان ہی اس پر چڑھ سکتا تھا۔ وہ کسی اور کو سوائے انوپ سنگھ کے تو پاس بھی پھٹکنے نہ دیتی تھی"۔ میں ایک اور سپنا دیکھ رہا تھا۔ چاند سے بھی زیادہ خوبصورت ایک دلہن ہے جس کی آنکھیں گھونگھٹ کے پیچھے ستاروں کی طرح دمک رہی ہیں۔ اور اس کی سرخ چنری میں کچھ دھبے لگے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا، "یہ کیسے دھبے ہیں"؟ یکایک اس کا گھونگھٹ خود بخود ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے زور سے چیخ ماری۔ آنکھ کھلی ہے تو دادی مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہہ رہی تھی۔ "کیوں میرے لال کیا ڈر گیا ہے۔ کیوں میرے لال کیا بات ہے کیا تو نے ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے۔ کیسا سپنا تھا مجھے تو بتا۔ نی چنتی ذرا پرے ہٹ" وہ سوئی ہوئی چنتی کو دھکیل رہی تھی "جگہ تنگ ہے نا۔ دل پر بوجھ پڑ گیا ہوگا۔ کاکا دیکھ ہاتھ سینے پر نہ رکھ" مگر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا

اندھیرے میں ہر طرف وہ آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اُبلی ہوئی آنکھیں جو گھونگھٹ کے پیچھے پوہ کی رات میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ ساری رات دادی سو نہ سکی۔ میں گھڑی گھڑی چونک پڑتا اور ڈر جاتا۔ درختوں کی سائیں سائیں میں الوؤں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ اور بند درزوں میں سے نہ جانے کس طرح ہوا تیر کی طرح میرے ننگے جسم پر لگتی تھی۔ پھر بھی اس میں ایسی سختی نہ تھی۔ جیسی اس ہوا میں ہے۔ جو ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سیدھی میرے منہ پر آکر لگتی ہے۔

اور اس رات کے بعد میں نے سپنے دیکھنے شروع کر دیئے۔ سپنے کوئی دیکھ کر تھوڑی آتے ہیں۔ اچھے ہوں یا بُرے نہ تو سہانی راتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور نہ انسانوں کا۔ سپنے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ دیپو کے خاوند سے بھی زیادہ ظالم۔ جس نے اُسے سہاگ رات ہی میں مار دیا تھا۔ اگر دیپو کی یاد بس اتنی ہی ہو۔ کہ پریوں کی کہانی کی طرح وہ تھی۔ وہ بیاہی گئی اور وہ مر گئی۔ تو بات کہنے کو کچھ بھی نہ رہے۔ میں جو ساری عمر ہر عورت کے چہرے کی طرف یوں دیکھتا رہا ہوں۔ کہ اس کی ایک ادا کی جھلک کہیں پا سکوں۔ یوں عمر نہ گزارتا۔ پر یہ تو ہونی کی بات ہے۔ جس کے نصیب میں جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے انسان کے روکے آنے والے حالات نہ تو رُکتے ہیں اور نہ ہی رُخ بدلتے ہیں۔ حالات تو سیلاب کا پانی ہے جدھر جی چاہے نکل جائے کوئی قید تو نہیں نا۔ کبھی کبھار میں نے چاہا ہے۔ نہیں میں نے صرف سوچا ہے کیونکہ چاہنے سے کیا ہوا کرتا ہے کہ اس شکتی سے جو نصیب بناتی ہے پوچھو دیپو

کو بنائے اور پھر اُسے مٹی کی مورت کی طرح مٹا دیتے ہیں کیا راز ہے؟ اکثر سوچتا ہوں وہ تو تھی ہی نہیں وہ کوئی بھی نہ تھی۔ یہ میرے اپنے سوچنے کی ہی بات ہے۔ انسان کو واہ گرو نے مہا شکتی بنایا ہے۔ ایسا گرنتھ صاحب میں بھی لکھا ہے۔ اور چوپال میں بڑے بوڑھے بھی یہی کہتے تھے۔ گرنتھی کہر سنگھ بھی پاٹھ کے سمے رو رو کر یہی کہا کرتے تھے۔ کہ انسان کو بہت بڑا بنایا گیا ہے۔ پھر دیپو کون تھی وہ کیا تھی۔ اور میں کیا ہوں۔ کہ ہم نہ مہا شکتی ہیں اور نہ بڑے۔ اب تو مجھے پورا وشواس ہے کہ ہم ان کیڑوں سے بھی کم ہیں جو اپنی مرضی سے رنگ برنگا کھا کے دنوں میں اپنے سوراخ میں گھس جاتے ہیں۔ پہلے پہل میں بحث کیا کرتا تھا۔ اب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے نہ گرنتھ صاحب پر یقین ہے اور نہ کسی اور شے پر۔ گرنتھی جو کچھ کہے وہ جھوٹ ہے جو کتابوں میں لکھا ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ سب کچھ جھوٹا ہے۔ یہ سارا سنسار ہی کچھ نہیں بلونت سنگھ خود تو کبھی پاٹھ نہیں کرتا۔ پر اپنے گھر میں اس نے میرے لئے ایک پوجا گھر بنا رکھا ہے جہاں روز سویرے گرنتھ صاحب پہ پھول چڑھتے ہیں۔ اسے کیا پتہ ہے کہ میں گرنتھ میں یقین رکھتا ہوں اور نہ گروؤں میں۔ وہ بھی ہماری طرح بیچارے کمزور آدمی تھے۔ جو اونکار کا نام جپتے اور اندھیرے میں راہ ٹٹولتے سرگباش ہو گئے۔ ساری چیزوں سے میرا وشواس اٹھ گیا ہے پر دیپو تھی۔ اس پر مجھے پکا وشواس ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو پھر آج دل میں یہ جلن سی نہ ہوتی۔ یہ ساری عمر میں نے ایک ایک عورت کے چہرے کو کیوں غور سے دیکھا ہے۔ کہ شائد کسی کی آنکھوں میں اس کی آنکھوں جیسی سیاہی ہو۔ کسی

کے ہونٹوں پر ویسی مسکان ہو کوئی بات کرتے ہوئے دیپو کی طرح تھوڑا تھوڑا
مسکراتی ہو۔ کسی کے چہرے پر ایسا ہی سنہرا پن ہو۔ اور ویسی ہی زردی جیسے چاند
اور سورج کی روشنیاں دور دور سے ایک دوسرے کے گلے مل رہی ہوں۔ کسی کی چوٹی
ویسے ہی جھولتی ہو۔ کسی کا قد ویسا ہی لمبا ہو جو لمبا تو نہ لگے۔ مگر میرے کندھوں تک
پہنچتا ہو۔ اور جس سے بات کرتے ہوئے میرا دل یوں پھیلے مانو سینے کی حدوں کو توڑ
کر باہر نکل جائے گا۔ دیپو کی باتوں میں صرف یہ احساس کہ وہ میری طرف دیکھ لیتی
ہے۔ تیر کی طرح ہڈیوں کے اندر گھسنے والی سرد ہواؤں میں بھی گرم رکھتا ہے۔ اور دوست
یار طعنے دیں۔ کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے یہ بے پیئے مست کیوں رہتا ہے۔

دیپو مری نہیں اس پر مجھے پکا یقین ہے۔ اس کے اور میرے درمیان
ایک اوٹ ضرور ہو گئی ہے۔ جو کنٹے پہنے براتیوں اور اونٹوں کے گلے میں پڑی
گھنٹیوں نے کھڑی کی ہے جو شنگاری ہوئی جو ان گھوڑیوں نے زمین پر اپنے
پاؤں مار مار کر اور ڈمیں ہلا ہلا کر ہلکی ہلکی گرد اڑا کر بنائی ہے جو باجے بجانے
والوں نے اپنے سُروں میں سرملا کر کبھی نہ ختم ہونے والے راگوں سے اونچی کی
ہے۔ اتنی اونچی کہ اب آکاش بھی میری نظروں سے چھپ گیا ہے۔ تارے
بھی اور تاروں جیسی آنکھوں والی دیپو بھی۔ ان راگوں میں چرخوں کی گھوں گھوں
بھی ہے۔ پتوں کی ہلکی سرسراہٹ بھی ہے بارش کے دیواروں پہ پڑنے اور پرنالوں
کے برکھا رُت میں مسلسل چلنے کی سڑ سڑ ہے۔ اور نیم تلے کنواریوں کی ہنسی بھی
اس میں شامل ہے۔ پنگھٹ پہ گاگریں رکھنے گھڑے اٹھانے سے لے کر رہٹ کی
رُوں رُوں، وودھ دوہنے اور دودھ بلونے کی ساری تانیں ہیں۔ تاروں کی

چھاؤں تلے ہل چلانے، اور بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹناہٹ تو اس کا آتم سر ہے۔ کیا راگ کی دیوار ہے میرے اور اس کے درمیان سدا ہی رہے گی۔ میں یہ راگ سنتا رہا ہوں۔ پر دیپو کو بھولا نہیں۔ راگ کی دیوار کے دوسری طرف لاجونتی کی طرح سکڑی ہوئی وہ اپنی ڈولی میں بیٹھی ہوگی۔ پر وہ تو رتھ میں چڑھ کر گئی تھی۔ اور ناگوری بیلوں نے اس رتھ کو کھینچا تھا۔ اس روز سارا دن میں شراب پیتا رہا تھا اور مدہوش رہا تھا۔ میری آنکھیں بہت سرخ تھیں۔ میں اونچی اونچی لے میں ماہیا گاتا اپنے کھیتوں کے کنارے گھومتا رہا تھا۔ پھر سنا تھا۔ بارات دیپو کو لے کر چلی بھی گئی۔ میری ماں کہہ رہی تھی —— "واہ واہ بھئی ایسا بیاہ تو کبھی نہ دیکھا اور نہ سنا۔ بلے بلے بھئی، مہر سنگھ نے اپنی بیٹی کو کتنی دت دات دی ہے" اور گاؤں میں یوں سناٹا تھا جیسے گاؤں نہیں شمشان ہو۔

چوپال میں اس دن بڑی بھیڑ تھی سارا گاؤں ہی جمع تھا۔ میرے باپو کو اپنے باپ سردار انوپ سنگھ اور بھاگو کو مار کر نہر میں پھینک دینے اور پھر بڑے شہر کی عدالت میں جاکر اپنا قصور مان لینے کے الزام میں پھانسی کی سزا ہو گئی تھی۔ سیشن جج نے موقع کا کوئی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے باپو کو معاف کر دیا۔ مگر ہمارے دشمنوں نے جو پنڈ کے سارے سردار اور بڑے شہ زور تھے۔ بھاگو کی موت کو یونہی سہارا بنا کر ہم سے بدلہ لینے کی سوچ لی تھی۔ مجھے ان دنوں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ پھانسی کیا ہوتی ہے، عدالت کیا ہے، جج کیا ہے؟ اپنی بھینسوں گائیوں کے پیچھے ننگے پاؤں جاتا اور انہیں چرنے کے لئے چھوڑ کر خود اپنے دوستوں اور ساتھ کے لڑکوں میں مل کر گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا ایک دن کسی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی تو دیسو نے کہا، "چل چل تو ہمارے ساتھ

نہ کھیلا کر۔ تیرے باپ کو تو سزا ہو گئی ہے" پھر دوسرے لڑکے بھی دلیسو کے ساتھ مل گئے۔ اور سب مجھے چھیڑنے لگے۔ میں دوپہر کو روتا روتا بھینسوں کو ہانکتا اور کرتے سے اپنے آنسو پونچھتا گھر آ گیا۔ ماں بڑی اداس تھی۔ اور چپکے چپکے آنسو بہاتی چرخہ کات رہی تھی۔ دادی کپاس بیل رہی تھی بے وقت گلی میں ٹن ٹن کی آواز سن کر کئی عورتوں نے اپنے دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر دادی اٹھ کر آئی اور بولی "کیوں کاکا دوپہر کے وقت ہی کیوں ماں کو گھر لے آیا ہے۔ بھینسیں اس طرح گندی ہیں، انہیں نہلایا بھی نہیں اور ....." پھر اس نے میری شکل کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئی بھینسوں کو باندھ کر وہ میری طرف مڑی اور بولی۔

"کیوں کاکا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟" میرے آنسو راستے میں ہی خشک ہو گئے تھے۔ مگر میں سوچ رہا تھا۔ کئی مہینوں سے میں نے باپو کو گھر میں نہیں دیکھا آخر کوئی بات ہو گئی ہی نا۔ دادی سے میں نے پوچھا "اتے کو تو نے کہاں بھیج دیا ہے۔ لڑکے کہتے ہیں اس نے اپنے باپ کو مار دیا تھا۔ اور اسے سزا ہو گئی ہے وہ کہاں ہے۔ سزا کیا ہوتی ہے۔ میں اتے کو ساتھ لے جا کر لڑکوں کا خون پی جاؤں گا۔ لا مجھے اپنی کرپان دے"

دادی دھوپ میں کھڑی آنگن میں گڑی ہوئی مورتی لگتی تھی۔ وہ نہ ہلتی تھی اور نہ ہی میری بات کا جواب دیتی تھی۔ اس کے سر پہ دوپٹہ نہ تھا۔ اور سفید بال چمک رہے تھے۔ جیسے ریشم کے لچھے ہوں۔ ماں چرخہ چھوڑ کر آ گئی اور میرے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ ایک لمحے میں میں بچپن سے بڑھاپے تک کا راستہ پار کر گیا۔ دادی کی مورتی اور ماں کا ہولے ہولے رونا دونوں باتیں میری

سمجھ سے باہر ہونے کے باوجود ایسی نہ تھیں جنہیں میں بھلا سکتا۔ دونوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پر مجھے معلوم ہو گیا کہ لڑکوں کا کوئی قصور نہیں۔ دیسو نے سچ کہا ہے اُتّمے نے اپنے باپ اور بھاگو کو مار دیا ہے۔ اور بہت سالوں پہلے سنی ہوئی کہانی میرے ذہن میں جھٹکوں سے آگے بڑھنے لگی مجھے وہ سیاہ رات یاد آگئی۔ اس رات دادی کی اُداسی یاد آگئی۔ بنتی مجھ سے ایک سال ہی بڑی تھی پر بہت اچھڑ باہر سے کھیلتی ہوئی آئی۔ ایک ہاتھ میں اپنی گڑیا کی چوٹی تھی۔ اور دوسرے میں اس کے کپڑے۔ ہمیں روتا دیکھ کر وہ بھی یونہی زور زور سے چیخنے اور رونے لگی۔ اور ماں مجھے چھوڑ کر اسے بازو سے پکڑے گھسیٹتی ہوئی اندر کوٹھڑی میں لے گئی۔ خالی ناند میں بھینسیں یونہی منہ مارتیں اور پھر اندر کی طرف تکنے لگتیں۔ گوبر اور اپلوں کی بُو کی سڑاند لو کی تپش میں ملی ہوئی تھی۔ اور آسمان پہ کوئی چیل زور زور سے کٹیں کٹیں کرتی اڑتی اور جا کر بڑے پیپل پہ بیٹھ جاتی۔ نتھوں کے سرسرانے کی آواز آتی پھر کوے کائیں کائیں کرتے زرد آسمان کے نیچے پر پھیلائے ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتے۔ سارا گاؤں بے حد چپ تھا۔ موت کی طرح اداس اور خاموش۔ پھر دادی بھی اندر آگئی اور بولی۔ دیکھ دلدار سنگھ اس بات کا بدلہ تجھے لینا ہوگا۔ اُتّمے نے اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لیا۔ اور تجھے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا ہوگا یہ ایسی طرح سے ہوتا آیا ہے۔ نہ کوئی بے گناہ ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی گناہ گار۔ یہ ماجھا ہے اور یہاں سرداروں کے خاندانوں میں پشتوں سے یہ دستور ہے۔ جس کی آن ہے ان کا سب کچھ ہے۔ اُتّمے نے باپ کو مار کر کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ اور نہ

ہی تو کوئی قصور کرے گا۔ یہ پاپ نہیں۔"

دادی کی شکل اب اس گھڑی بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ پر یوں نہیں جیسے وہ روز معمولی باتیں کیا کرتی تھی۔ جیسے وہ ماں کو گالیاں دیتے وقت اپنی شکل پہ قہر لے آتی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہر لفظ اس کے منہ سے یوں نکل رہا تھا۔ جیسے روح کی گہرائیوں سے آیا ہو۔ اس کے چہرے پہ ایک روشنی تھی جو بس اندر سے ہی نکل سکتی تھی۔ اور باہر کی ساری روشنیوں سے الگ تھی۔ کبھی کبھار آکاش پر چاند کے حسن میں مجھے وہ روشنی جان پڑتا ہے دکھائی دی تھی۔

ماں بھی چپ چاپ کھڑی تھی۔ اور چنتی سہمی ہوئی دیکھ رہی تھی کوٹھڑی میں ہم چاروں تھے۔ میں اور ماں، دادی اور چنتی!

پھر دادی نے کہا یہ اس کہ پان پہ ہاتھ رکھ کر سونہہ کھا کہ تو اپنے باپ کا بدلہ ضرور لے گا۔ کیونکہ سردار ہرسنگھ نے ناحق اس معاملے میں بھاگو اور اس کے باپ کی طرفداری کی ہے اُسے معلوم ہے انوپ سنگھ اس کا دشمن تھا۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ ہمارے خاندان کا نام مٹا دے وہ صرف مجھے دکھ دینا اور تڑپا کر مارنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی ان کی اور ان کی عورتوں کی پروا نہیں کی۔ پانچ گاؤں کے مالک ہونا اور بات ہے اور بہت اونچے ہونا دوسری بات ہے۔" اس کے باوجود کہ دادی کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ اونچے ہونے اور نہ ہونے کی بات بھی بہت مشکل تھی۔ پر میں نے کر پان پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں اپنے

باپو اُتم سنگھ کی موت کا بدلہ مہر سنگھ کے خاندان سے ضرور لوں گا۔
پھر دادی ماں کی طرف منہ کر کے بولی " کہ بیٹے تُو کہے گی کہ میں نے
تیرا سہاگ برباد کیا ہے اور میں اب تیرے لڑکے سے بھی ایسی قسم اٹھوا
رہی ہوں جس میں اس کی جان کا خطرہ ہے۔ پر تو یہ سوچ خاندان کی آن بھی
کوئی شئے ہے۔ دلدار سنگھ اگر سر اونچا کر کے لالٹاں کی گلیوں میں چل نہ سکا۔
تو تیرے جینے کا کیا فائدہ اور اس کے جینے کا کیا فائدہ "
میں نے کہا " لا مجھے ابھی کرپان دے میں جا کر سردار مہر سنگھ
کو مار دوں۔ جس نے میرے باپو کو گھر سے دور قید میں رکھا ہوا ہے "
دادی میرے اس بھولے پن پر بڑے دکھ سے رو پڑی پھر اس نے اٹھ کر
میرا منہ سر چوم لیا۔ اور بولی " نہیں میرے لال ابھی وقت نہیں۔ ابھی نہیں
آیا نہ ویلا۔ میں زندہ رہوں گی اور جس دن تو مہر سنگھ سے بے عزتی کا بدلہ
لے گا۔ اس دن سکھ شانتی سے مر جاؤں گی۔ سکھ شانتی سے نہ بھی مروں
تو بھی کوئی بات نہیں۔ پر میرے کندھوں سے ایک بوجھ اتر جائے
گا "

ماں نے چاٹی میں سے لا کر ملائی والا گرم گرم دودھ کا گلاس مجھے
دیا اور میں چوپال کی طرف چلا گیا۔ جہاں ایک میلہ سا تھا۔ سارے بڈھے بڈھے
اکٹھے تھے اس دن سویرے ہی باپو کی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ اور ہمارے
گاؤں میں لوگ ہوتے ہوئے واہ گرو کا نام جپتے لمبی اونچی گلیوں میں دھوپ کی
وجہ سے ملتے ملاتے چلتے چوپال کی طرف جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے

اس سے پہلے کبھی اس گاؤں میں ایسا کام نہ ہوا ہو۔ اور نہ ہی کسی نے کبھی کسی کو مارا ہو۔ عورتیں چھپ چھپ کر تی ایک دوسری کے گھر آ جا رہی تھیں سارے گاؤں میں یہی چرچا تھا کہار بیٹھنے والوں کو پانی پلا رہے تھے۔ چمار گھوڑیوں پہ آنے والوں کی باگیں پکڑ کر انہیں گھوڑیوں سے اتار رہے تھے۔ اور پلنگ بچھا کر دے رہے تھے۔ اونچے قدوں والے مٹیالی سرخ آنکھوں والے لال پگڑیوں والے سردار گلے میں کارتوسوں کی پیٹیاں پہنے کندھوں سے رائفلیں اتار کر رکھ رہے تھے۔ ان کے تہمند پیچھے سے زمین پہ گھسٹتے تھے اور ان کے لمبے لمبے کرتوں سے بھی نیچے لٹک رہے تھے۔ گھوڑیاں ہانپ رہی تھیں اور ان کے نتھنے سورج کی روشنی میں گلابی لگتے تھے جیسے کسی کنواری کے لالی سے سرخ ہونٹ۔ کہار جھولوں سے شراب کی بوتلیں نکال کر چارپائیوں پہ رکھتے۔ جوانی چڑھتے لڑکے ذرا پرے ہٹ کر گاؤں کی مٹیاروں کی اپنے کتوں کی اور شراب کے مزے کی باتیں کر رہے تھے جو بیٹھے ہوئے سرداروں کے لئے پرانی ہو چکی تھیں۔ مگر کوئی بھی زور زور سے بات نہیں کرتا تھا۔ نئے آنے والے کی گونج دار ست سری اکال سنائی دیتی اور پھر وہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ شروع ہو جاتی۔ گھوڑیاں زمین پر سُم مارتیں اور ہنہنا کر اپنے مالکوں کو دیکھتیں اور پھر دانہ کھانے لگتیں جو حویلی کی ناندوں میں پڑا تھا۔

پھر جب گیانی جی بھی آ گئے۔ اور سردار ہر سنگھ کی ست سری اکال کی آواز بھی تھم گئی۔ فصلوں اور مربعوں زمین اور سٹے شہر اولادوں اور شادی بیاہوں۔ انگریزوں اور ان کی مہموں کی باتیں ہو چکیں تو گیانی جی نے

بات شروع کی ۔

"ہم کو یہ سُن کر بڑی چنتا ہوتی ہے کہ اُلم سنگھ کو پھانسی کی سزا ولایت کی عدالت سے ہوئی گئی ہے۔ پر جیسی واہ گرو کی مرضی کیا کہا جا سکتا ہے"۔

لڑکوں کے پلنگ پہ ایک طرف میں بھی بیٹھا تھا انہیں میرا پتہ نہیں تھا۔ وہ مجھے گاؤں کا ایک لڑکا یا بس یونہی کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ وہ سب اپنی باتوں میں مگن تھے۔ بڑوں کی باتوں میں ذرا سی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ان کے پاس سے عطر چھیل کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی اور کبھی کبھار تو ان کی کھی کھی کی وجہ سے مجھے بڑوں کی باتیں بھی سنائی نہیں دیتی تھیں۔

سردار مہر سنگھ نے کہا: "گیانی جی جو ہونی ہو اس کو روکا نہیں جا سکتا اور سرکار دربار سے ہمیشہ انصاف ہوتا ہے ہمیں کیا کہنا ہے۔ مگر ایک بات ہے اُلم سنگھ نے انوپ سنگھ کو مار کر اچھا نہیں کیا تھا آخر واہ گرو نے عورت کو اس لئے ہی تو بنایا ہے کہ مرد اس سے دو گھڑی کھیل کر جی خوش کرے۔ ہمیں تو اس گھڑی پتہ چلا ہے جب انوپ سنگھ کے ساتھ بھاگو بھی ماری گئی ہے۔ واہ گرو کی قسم مجھے تو کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ انوپ سنگھ اور بھاگو میں کوئی بات تھی۔ ویسے عورت طرحدار تھی۔ پر اب ماری گئی سو ماری گئی۔ میری تو انوپ سنگھ سے بول چال بند تھی۔ پھر بھی ناخنوں سے ماس تو الگ نہیں کیا جا سکتا نا۔ ہم سارے سرداروں کی برادری

ایک ہی ہے نا ۔ میں نے تو کوشش کی تھی ۔ پر جو ہونا تھا ہو چکا دس دن بعد اُتم سنگھ کو پھانسی ہو گی ۔ بیچارا بہت اچھا لڑکا تھا ۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا ۔"

گیانی جی نے کہا " سدا ہر ایک مصیبت کے پیچھے عورت ہی ہوتی ہے ویسے بھاگو انوپ سنگھ کی جوتی کی برابری بھی نہ کر سکتی تھی ۔ مگر راسی ہو گئی ۔ اور سب سے زیادہ بُری بات تو اُتم سنگھ نے یہ کی کہ جا کر خود عدالت میں کہہ دیا کہ میں نے مارا ہے ۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کسی کو بھی پتہ نہ چلتا اور وہ بچ جاتا ۔" مہر سنگھ نے کہا " سارا قصور اس کی ماں کا ہے جسے عزت کا اتنا خیال رہتا ہے اب دیکھو کھیتوں میں آپ کام کرتی ہے ۔ برادری والوں سے کسی کا احسان نہیں اٹھاتی ۔ نہ ہی اپنے مائکے والوں میں سے کسی کی منت کرتی ہے ۔ دھیان پور والوں کی بیٹی ہو کر کھیت میں کام کرے مگر اُسے تو کسی کی پروا نہیں ۔ واہگرو کی قسم میرا تو بس خون کھولا جاتا ہے ۔ جب اُسے کام کرتے دیکھتا ہوں اور ایک ہماری سوانیاں ہیں کہ انہیں کسی نے کبھی رتھ کے بنا کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا ۔"

اور بہت سے لوگ باتیں کرنے لگے ۔ پلنگوں پہ بیٹھے سردار اب اونچی آواز سے میری دادی کی ، بھاگو کی ، میرے باپو اُتم سنگھ کی فصلوں کی اور شرابوں کی ہر طرح کی باتیں کر رہے تھے ۔ لڑکے زور زور سے ہنس رہے تھے ۔ میرے جی میں آگ لگی ہوئی تھی ۔

گیانی جی نے کہا " سردار جی سب ٹھیک ہے پر اُتم سنگھ

کی ماں بیدھی اور آن پہ جان دینے والی بہادر عورت ہے اس میں رانیوں کی سی شان ہے اس سے آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیئے۔"

تھوڑی دیر چپ رہ کر سردار ہرسنگھ نے کہا۔" ٹھیک ہے گیانی جی پہ آخر سوانیوں کو پہ دے میں رہنا پاہیئے۔ گھر میں لاکھوں کام ہیں۔ باہر مرد ہیں کس لیئے۔ پہلے سر کا سائیں اٹھ گیا۔ اب جوان بیٹا پھانسی لگنے والا ہے۔ پھر بے سمجھ پوتے کو قربان کرے گی"۔ اور مجھے یوں لگا جیسے شام کے گہرے ہوتے سائے میں اس نے لمحے کے لیئے میری طرف بھی دیکھا پہ میں تو بڑے لڑکوں کی اوٹ میں تھا۔

پھر ان کی باقی باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ شراب پی رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے اور شام کے سایوں میں اور بھی بڑے بڑے دیو لگ رہے تھے میں چپکے سے وہاں سے کھسک آیا۔

رات ہو گئی تو دادی نے کہا" کرمو تیرا خیال ہے گھر میں کوئی جوان نہیں اور تو نے روٹی نہیں پکائی اٹھ تنور گرم کر اور دلدار سنگھ کو روٹی پکا کر دے۔ نی چنتی پانی لا کر دیر کا منہ ہاتھ دھلا"۔

اور اس رات کے بعد سے دادی نے پھر مجھے کاکا نہیں کہا۔

میری ماں نے تنور میں اپلے ڈالے پہلے نیلا دھواں نکلا اور پھر آگ کے شعلے زبانیں نکالے کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے، جیسے بھتنے ہمارا منہ چڑا کر بھاگ رہے ہوں۔ ہمسائے میں شیر سنگھ کی بیوی نے دیوار کے اوپر سے منہ نکال کہا" کیوں بہن تنور گرم کر لیا ہے میں ابھی سوچ ہی رہی تھی۔

کہ جا کر پوچھوں" پھر سلطان سنگھ کی بہن اور پتی کی دوسری عورتیں اپنے اپنے آنگنوں کی پرتیں اٹھائے ہمارے آنگن میں آگئیں۔ اور روز کی طرح بھیڑ لگ گئی۔ چنتی نے پانی کا کرنڈل لاکر میرے قریب رکھ دیا اور کہنے لگی۔

"کاکا منہ دھولے"

دادی نے دیئے کی مدہم روشنی میں پہلے اُس کی طرف بڑے غصّے سے دیکھا اور پھر اُسے قریب بلا کر کہنے لگی "دیکھ نی چنتی آج سے پیچھے اسے کسی نے کاکا نہیں کہنا۔ اس کا نام بُلایا کر پورا نام دلدار سنگھ"

چنتی نے جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا اپنے کندھوں پہ پڑی چھوٹی سی چنری کو درست کر کے سر پہ اوڑھ لیا اور پھر کہنے لگی۔

"دلدار سنگھ دیر منہ دھولے"

اور دادی نے خاموشی سے اُسے اپنی طرف کھینچ کر گلے سے لگا کر کہا "ہاں آج سے پیچھے اسی طرح کہا کر"

ساری عورتیں اپنی اپنی روٹیاں پکا کر چلی گئیں۔ دادی نے بھینسوں کا دودھ نکال کر ماں کو دے دیا۔ جس نے اُسے صبح کے دودھ میں اٹھا دیا۔ دیئے کی روشنی میں ماں کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اداس لگتی تھیں۔ وہ شائد اس وقت بھی رو رہی تھی۔ مگر دادی کے ڈر سے آواز نہ نکالتی تھی۔ پھر اس نے دودھ کو جمنے کے لئے رکھ دیا۔ چنتی کو روٹی دی مجھے مکھن کی پیالی اور دودھ

دے کر چولہے میں جا بیٹھی اور راکھ سے رگڑ رگڑ کر برتنوں کو چمکانے لگی۔ شاید چودھویں تاریخ تھی کہ سورج کی سرخی میں چاند کی زردی مل رہی تھی اور دیئے کی روشنی پر ایک بیمار سی دھند تھی جیسے بس دیا بجھنے ہی والا ہو۔

پھر گلی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ہمارے بڑے سے دروازے میں ذرا جھک کر گھوڑی پر چڑھا چڑھا ہی دادی کا بھائی چانن سنگھ اندر آ گیا۔ وہ آنگن میں آ کر گھوڑی سے اتر پڑا اور دادی بڑی بیمار سی اٹھ کر اس سے ملنے کے لئے چارپائی چھوڑ کر آنگن میں آ گئی۔ ماما چانن سنگھ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو مجھے یوں لگا جیسے دادی کی چیخ نکل گئی ہو۔ اس نے کہا "حوصلہ کر کاکی حوصلہ کر۔" پر اس کی آواز خود آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور بڑی مشکل سے نکل رہی تھی۔ جیسے اس کے گلے میں رندھن ہو اور بولا نہ جاتا ہو آخر مقدر اور تقدیر کے سامنے کوئی کیا کر سکتا ہے کتنا بے بس ہے انسان؟

ماں چولہے میں بیٹھی تھی اس کے ہاتھ کا برتن ہاتھ میں تھا اور وہ آج اپنا گھونگھٹ بھی کاڑھنا بھول گئی تھی۔ ماما چانن سنگھ نے دو ایک بار کھنکھار کر گلا صاف کیا اور دادی نے کہا "ری کڑیئے ویر چانن سنگھ آیا ہے" تب جیسے ماں کو ہوش آیا اور اس نے گھونگھٹ کھینچا۔ دادی نے ماما کو میرے پاس بٹھا کر کہا "ویر تو میرے دلدار سنگھ سے باتیں کر، میں پانی دھونی لاؤں۔" مگر ماما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "نہیں کاکی، میں نے نہ پانی پینا ہے اور نہ روٹی کھانی ہے۔ میں تو بس تجھے دیکھنے اور یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ ساری قدرت

مہر سنگھ کی ہے اس نے پورے دو مربعے بیچ کر رشوت دی ہے۔ اور اُتم سنگھ کے لئے ولایت جاکر خود پھانسی کا حکم لے کر آیا ہے۔ بس اب ان لوگوں سے خبردار رہنا۔"

دادی نے بڑی بے بسی سے کہا" کیوں وہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری ساری زمین بیچ دے۔ میرا پوتا چھوٹ جائے۔ میرے اُتمے کو گھر واپس لادے۔" وہ ہاتھ ملنے لگی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ جنہیں اس نے خشک نہیں کیا۔ پلو اس کے گلے میں پڑا تھا۔ اس کا سر ننگا تھا اور چاند کی روشنی اس کے بالوں کو بھی سفید کیئے دیتی تھی۔ دیئے کی لَو بار بار ہوا کے جھونکوں سے کبھی ایک طرف جھکتی اور کبھی دوسری طرف۔ زبان کی طرح وہ ان دیکھی چیزوں کو چاٹ رہی تھی۔ چنتی پیچھے کھڑی ماے کو ہولے ہولے پنکھا جھل رہی تھی اور میری طرف، ماں اور دادی کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ماے نے کہا" کاکی صبر کر۔ تیرا تو دل دریا تھا تجھ میں تو پہاڑوں کا حوصلہ ہے۔ دشمنوں نے برا مارا ہے۔ اگر پتہ ہوتا کہ مہر سنگھ اس طرح زہری سانپ بن کر ڈسے گا۔ تو ہم پہلے سے ہی ہوشیار ہو جاتے۔ تیرا خیال ہے اُتم سنگھ مجھے کم پیارا تھا۔ میں آج سارا دن علاقوں گھروں میں مارا مارا پھرتا آیا ہوں۔ اب پھر شہر جا رہا ہوں۔" پھر وہ جانے کے لئے اٹھا تو دادی نے کہا۔

" تجھے میری قسم اس وقت جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سویرے

تاروں کی چھاؤں میں چلے جانا - چاندنی ہو یا اندھیری رات، سپاہی ونڈ تو موت کا گھر ہے۔"

ماسے نے کہا "کاکی تو ناحق ڈرتی ہے۔ میں پہلے کانیاں جاؤں گا وہاں سے دوسرے راستے جانا ہے۔ مجھے یہاں سے کئی اور آدمیوں کو بھی ساتھ لینا ہے۔ دعا کر شاہ مدد اگرو جنگی کرے، کرتار سوہنی کرے۔ ناامید کیوں ہوں وہ تو ڈوبتے بیڑے تیرا دیتا ہے۔ تُو نے کیا قصور کیا ہے؟"

پھر میں نے ماسے چانن سنگھ کو اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے اور دروازے سے باہر جاتے دیکھا۔ دادی وہیں آنگن میں کھڑی تھی۔ دھیان پور والوں کی بیٹی لاڑاں والوں کی برادری کی عورت جس نے رو رو کر اور زاری کر کے اپنے ویر سے التجائیں کی تھی۔ دادی کے بعد میں نے اس شان کی کوئی عورت کبھی نہیں دیکھی۔

ان دس دنوں میں میں دس عمریں پار کر گیا۔ دس زندگیاں جس میں میں نے زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی سے لیکر موت تک کا چہرہ دیکھ لیا۔ مایوسی اور امیدیں دیکھ لیں۔ آنے والی زندگی کی شفقتیں اور محبتیں دشمنیاں اور بدلے سب صف باندھے میرے سامنے کھڑے ہو گئے گویا میں راجہ ہوں اور انہیں مجھے سلام کرنا ہے، پرے باندھے، اچھے برے چہرے، مکروہ شکلیں، اداس اور بے گناہ، خوش گناہ گار، موت سے ڈرنے والے اور ہنس کر موت کا سواگت کرنے والے سبھی دیکھ لیے۔ وہ دس دن ایسے کٹھن تھے کہ پہاڑوں کی بلندیاں ان کے سامنے کچھ نہیں اور پھر بھی میں

سوچتا ہوں انسان جب تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا سانس چلتا ہے وہ دنیا کے نئے پن میں کوئی نہ کوئی ایسی کشش تو پاتا ہی ہے نا۔ ورنہ ایک لمحے کے لیے جب زندگی سے زیادہ موت پیاری لگتی ہے انسان جیئے کیونکر؟

ہمارا ج پور سے میری ماں کے بھائی آئے، بھابیاں آئیں اس کی روتی ہوئی ماں آئی۔ تو دادی نے آنگن میں کھڑے ہو کر کہا "دیکھو سردار تی جی سکھ سے میرا پوت زندہ ہے۔ واہگورو خیر کرے میں کسی کو اس کی زندگی میں رونے نہیں دوں گی! اور موت پہ تو کسی کا کوئی زور نہیں"۔

اور نانی نے اپنی آنکھیں پونچھ کر کہا "ٹھیک ہے بہن جی، سب ٹھیک ہے پر مجھے تو اپنی بیٹی کے سہاگ کا رونا ہے جو جوان جہان ہی اجڑ گئی"۔

دادی نے چیخ کر کہا "میں اپنے گھر میں کسی سے اجڑنے بسنے کی باتیں نہیں سننا چاہتی جس کا جی چاہتا ہے آئے جس کا جی چاہتا ہے نہ آئے۔ ایسی باتیں کرنے اور کہنے کے لئے ایک عمر پڑی ہے جو ہوگا سو تو ہوگا ہی پہ میں اکتم سنگھ کے جیتے جی ایسی باتیں نہیں کرنے دوں گی"۔

پھر دیواروں پہ لٹکی اور دازوں میں جھانکتی اور بڑے دروازے میں کھڑی عورتیں خاموشی سے پلٹ گئیں۔ نانی اور ماں کی بھابیاں اندر بیٹھ گئیں۔ دادی نے انہیں نئے جھالروں والے پنکھے نکال کر دیئے اور پھر کہا سی سے ٹھنڈے کھوہ سے پانی منگوا کر انہیں شربت بنا کر دیا۔ نانی نے جب کہا کہ ہمیں پیاس نہیں تو دادی کہنے لگی۔

"سردار نی جی میرا بستا گھر ہے میرا بیٹا ابھی زندہ ہے۔ مصیبت کس پہ نہیں آتی کیوں میرے گھر سے کوئی بھوکا پیاسا جائے۔" پھر ماں نے آٹا گوندھ کر تنور گرم کیا اور بھاجی پکا کر سارے ننھیال والوں کو کھلائی۔ ماں کی بھابیوں کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ نانی آنسو بھری آنکھیں پلو سے پونچھتی ہوئی نوالے کھاتی اور دادی سے اُتم سنگھ کے دشمنوں کی باتیں کر رہی تھی۔

دادی انہیں ساری باتیں سمجھا رہی تھی۔ پھر میں نے آنگن میں گھوڑیوں کے رکنے کی آواز سنی۔ ماں کے ویر گھوڑیوں سے اتر رہے تھے۔ دادی بھی وہاں آگئی۔ شمشیر سنگھ ماما نے جھولا کھول کر دادی کو سرخ سرخ پونڈ دکھائے اور بولا "میں اپنی بہن پہ سے اپنی ساری دولت وار دوں اگر کوئی اُتم سنگھ کو بچانے کی راہ مجھے دکھا دے۔" اور دادی نے بڑی آن سے کہا "بھائی واہگورو تجھ کو اپنی دولت آپ بھوگنا نصیب کرے، تو اپنی جوانی آپ جیئے اور یہ دولت برتے، کوشش کر دیکھو۔" اور پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولی "ہم کڑیئے اندر کیا بیٹھی ہے آ کر اپنے ویر سے مل۔" ماں دروازے کی دہلیز سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی پر چیخ نہ سکتی تھی۔ صبر کے سارے بندھن ٹوٹ رہے تھے اس کی بھابیاں اسے سہارا دے رہی تھیں اور خود اپنے اپنے پلو سے آنکھیں ڈھانپے ہوئے تھیں۔ کوئی زور سے رو نہیں رہا تھا جیسے ہچکیاں سینے میں گھٹ رہی ہوں اور دادی خشک آنکھوں سے بہت قہر بھری نظروں سے سب کی طرف

دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھر میں اس کے بیٹے کی زندگی میں لوگ رو کیوں رہے تھے؟

دادی اگر دکھ کے سامنے چٹان نہ بنتی تو مٹی کے تودے کی طرح ڈھے جاتی۔ دھیان پور والوں کی سردارنی بیٹی نے دشمنوں اور رشتہ داروں کے سامنے جس شان اور جس دل گردے کا ثبوت دیا اس پر سارے اپنے بیگانے حیران رہ گئے۔ دم دم نہر سنگھ کے گھر کی کہاریاں اور چمارنیں گلی سے گزرتیں۔ شاید بین کرنے کی آواز آئے شاید سردارنی کرتار کور، انوپ سنگھ کی موت پر آنسو پی جانے والی اب بیٹے کی موت کی خبر سن کر پلو پھیلا پھیلا کر روئے اور دشمنوں کی بددعائیں دے۔

برادری والے آتے لالاؤں کی لڑکیاں، بہوئیں، عورتیں، سردارنیاں، کہاریاں، ان دنوں گھر میں اتنا آنا جانا رہتا۔ ماسے چانن سنگھ نے اپنے کام کرنے والوں کو ہمارے کھیتوں کی رکھوالی کے لئے بھیج دیا تھا۔ پھر بھی دادی روز سویرے آپ کھیتوں پر جاتی۔ بھینسوں کی سانی کرتی۔ دودھ دوہتی اور آنے والوں کی خاطر داری کرتی۔ عورتیں شربت پی کر جاتیں تو کہتیں "عورت نہیں پتھر ہے اتنا سخت دل تو واہگرو کسی کا نہ کرے ڈائن ہے ڈائن! خصم مرا تو تب اتنا روئی اور اب اُتم سنگھ کو پھانسی ہونے والی ہے پر اس کی آنکھوں میں ایک آنسو نہیں۔ ہر ایک کو پانی پلاتی ہے خاطر کرتی ہے جیسے اس کے گھر بدھائی دینے گئے ہوں اور کل پرسوں برات آنے والی ہو"

چوپال کی بھیڑ بھاڑ میں بیٹھا سردار مہر سنگھ کہتا "بلے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے بھی زیادہ حوصلے والی، دھیان پور والے ہی ایسی شیرنی پیدا کر سکتے تھے۔ ہمارے گھر کی سوانیاں تو چوہے سے بھی ڈر جائیں۔ پردوں میں بیٹھنے والیاں جو ہوئیں۔ بھئی ہم سردارنی کرتار کور کا مقابلہ کر سکتے ہیں بھلا؟" پھر وہ طنز سے ہنستا اور سارے بیٹھنے والے یا تو اس کا ساتھ دیتے یا چپ کر کے منہ پھیر لیتے۔ اور رفتہ رفتہ چوپال میں وہ جوش اور ولولے کی باتیں نہ ہوتیں۔ صرف مہر سنگھ کہتا "بھئی انوپ سنگھ کو مارا تھا تو بھاگو کو رہنے دیتا اتم سنگھ، ہمارے کام آتی۔ آخر اس بیچاری کا کیا قصور تھا جب انوپ سنگھ نے اسے اپنی سوانی سے زیادہ درجہ دے رکھا تھا تو اس نے تو سر چڑھنا ہی تھا" دو چار دنوں کے اندر اتم سنگھ کے پھانسی پانے کی بات چوپال میں پرانی ہو گئی۔ لاڑاں کی لڑکیاں بہوئیں اب شام کو گاؤں کے باہر ناچتی اور گاتی ہوئی اگر میری ماں اور دادی کو دیکھ لیتیں تو ناچتی رہتیں اور لحاظ کے مارے چپ نہ کر جاتیں۔ دادی کہتی "کڑیو ناچو یہی تو ہنسنے کے دن ہیں۔ پھر نہ جانے سسرال کے گھر میں کیا کیا سہنے کو ہو۔ پر واہگرو ہر ایک کے نصیب اچھے ہی کرے۔ کرتار چنگی کرے۔"

دادی کے بھائی مامے جاتن سنگھ اور میرے مامے شمشیر سنگھ کی ساری دوڑ دھوپ فضول گئی۔ ولایت سے آیا ہوا حکم دس دنوں میں کہیں بدل سکتا ہے؟ سُرخ پنڈوں سے بھرے ہوئے جھولے، سفارشیں روپیہ پیسہ سب مل کر بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے باپو اتم سنگھ

کی زندگی کوئی شے دے کر خریدی جا سکتی تو دادی ضرور اپنے آپ کو اس پہ سے قربان کر دیتی۔

جس دن چیل ہیں، ہیں، ماں، دادی اور چنتی اُسے ملنے گئے ہیں۔ اُس دن دادی نے گڑھ والی میٹھی روٹیاں پکائی تھیں۔ وہ روز کی طرح تاروں کی چھاؤں میں اٹھی۔ پھر سب سے پہلے اس نے چنتی کو نہلا کر وہ جوڑا پہنایا جو شادی بیاہوں اور کسی کے ہاں مہمان بن کر جانے کے لئے پہنا جاتا تھا۔ چنتی بہت خوش تھی اور ماں سے سر گندھواتے ہوئے کہہ رہی تھی "ماں یہ پوشاک تو دھیان پور جانے کے لئے رکھی تھی۔ ہم دھیان پور جا رہے ہیں؟" جوتا پہنتے ہوئے وہ بولی "ماں بس میں تو اب ہر وقت یہی جوتی پہنا کروں گی۔ چاہے تو مجھے مارے چاہے چھوڑے۔" پھر دادی نے لسی بنا کر مکھن نکالا اور اُسے ایک مٹی کے رنگین کٹورے میں ڈھانپ کر لسی کے برتن کے اوپر رکھ لیا۔

مجھے کپڑے پہناتے ہوئے کہنے لگی "دلدار سنگھ ہم اُتمے کو ملنے جا رہے ہیں۔ پر دیکھ۔۔۔۔" وہ چپ ہو گئی تو میں نے کہا "دادی تو نے کیا کہنا تھا؟"

بولی "نہیں کچھ نہیں کہنا۔ تو بھی اپنی جوتی پہن لے۔"

ماں کے چہرے پہ ایسی زردی تھی اور وہ اتنی کمزور لگتی تھی جیسے مرنے والی ہو اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ مگر پھر بھی دادی نے اُسے سب سے اچھا جوڑا نکال کر دیا۔ جب ماں پلنگ پہ پڑے جوڑے کی طرف دیکھتی

رہی تو دادی نے کہا "پہن لے، پھر کون تجھے ان کپڑوں میں دیکھنے والا ہوگا۔ اور دیکھ اپنے ہونٹوں پہ ذرا سی لالی بھی لگا لے، آنکھوں میں کاجل لگانا نہ بھولنا۔ چل میری بیٹی بس اب جلدی سے تیار ہو جا۔ چانن سنگھ آنے والا ہوگا۔"

دادی کی آواز میں اتنی نرمی مجھے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ایسی نرمی جسے محسوس کر کے بے اختیار رونے کو جی چاہتے لگتا ہے۔

جب سورج سپاری ڈنڈ کے گھنے باغ میں راہ تلاش کرنے نکلا ہے اور بڑی نہر کی لہریں سرخ اناروں کی طرح لگتی تھیں ہم لالڑاں سے چار میل نکل آئے تھے۔ دادے کی سب سے جی دار اور منہ زور گھوڑی پہ دادی بیٹھی تھی اسکے بعد میں اور چنتی ایک بڑی غریب طبیعت کی گھوڑی پہ آگے پیچھے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھے۔ چنتی نے پیچھے سے زور سے میرا کرتا پکڑ رکھا تھا اور بار بار ہنستی ہنستی دوہری ہوئی جاتی تھی۔ چمار ہمارے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ماں تھی جو جہیز میں ملی گھوڑی پہ گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ اور لگامیں تھامے ہوئے اپنے خیالوں میں نہ ہنستی نہ بولتی تھی۔ اس کی نئی گلابی شلوار کے پائنچے سورج کی کرنوں میں جگ مگ کرتے چمک رہے تھے۔ دو ایک دفعہ چنتی نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے اتنا ڈر لگا کہ وہ چیخ پڑی اور میں گرتے گرتے بچا۔ سب سے آخر میں ماما چانن سنگھ

تھا۔ جس کی شکل مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب میں نے اپنے باپو کو دیکھا تو میرا دل اچھل کر منہ میں آ گیا۔ آگے کو پہلے دادی نے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے منہ سر کو چوما۔ پھر پیارے چانن سنگھ نے اس کو گلے لگایا۔ ماں کو دیکھ کر باپو نے کہا ——" جیتو بیٹھ جا۔ کیا حال ہے؟" مگر ماں کچھ نہ بولی۔ جتنی دیر ہم وہاں بیٹھے رہے جنتی باپو کے گلے میں باہیں ڈالے بیٹھی رہی۔ دادی نے میٹھی روٹیاں نکال کر اسے دیں۔ تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔ اور بڑے بڑے نوالے کر کے کھانے لگا۔ مکھن سے گیلے ہاتھوں کو اس نے اپنی مونچھوں اور داڑھی پر مل لیا۔ زور سے ڈکار لے کر بولا۔

" ماں واہگرو کی قسم تیری طرح میٹھی روٹیاں ساری دنیا میں کوئی نہیں پکا سکتا۔ ہاں میری بھوری بھینس کا کیا حال ہے۔ وہ مجھے بہت پیاری ہے دیکھ اس کا خیال رکھا کرنا جیتو۔ تو بولتی نہیں، کتنی پیلی ہو رہی ہے۔ ماں تو اسے پیٹ بھر کر روٹی نہیں دیا کرتی کیا جیتو بھی خوش رہا کرنا۔ گرنتھ صاحب کے سامنے تیرے میرے پھیرے ہوئے تھے اور میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ تجھے خوش رکھا کروں گا۔ مجھے دھاراج پور والوں سے شرمندہ نہ کروانا۔ میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔"

دادی نے جیسے کوئی بد بنی کہے۔ کہا "تم سنگھ پوت روٹی کھا لے۔ واہگرو تیری عمر دراز کرے۔" اور اُتم نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ میں ڈر گیا۔ اور جنتی پرے ہٹ کر اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے

لگی۔ دادی بولی "کیا تجھے گرنتھ صاحب پہ یقین نہیں۔ کیا تو نے گوردوارے میں یہ نہیں سنا کہ۔۔۔۔" اور پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنے منہ پہ پلو ڈال کر ہائے ہائے کرنے لگی۔ ماسے چانن سنگھ نے اُسے کہا۔ "تا کی ہمت کر صبر کر۔" وہ خود رو رہا تھا۔

اُس کے چہرے پہ اُداسی، جیسے بادلوں کا سایہ ہو ایک لمحے آئی۔ پھر اُس نے کہا "دلدار سنگھ ادھر آ۔ تو جوان پوت ہے اور اس بے عزتی کا بدلہ تجھے لینا ہوگا۔ عورت کا بدلہ عورت ہی ہوگی۔ دیکھ یہاں میرے سر پہ ہاتھ رکھ اور واہگرو کی قسم کھا کہ تو سردار مہر سنگھ سے بدلہ لے گا۔ بس عورت کا بدلہ عورت ہوگی۔ انہوں نے بھاگو کے بدلے اپنی ساری دولت لگادی ہے۔ حالانکہ بھاگو اس کی کچھ نہ لگتی تھی اور دیکھ چنتی تیری بہن ہے۔ اس سے اچھی طرح سلوک کرنا۔ اگر کبھی یہ کوئی غلطی کرے تو اُسے معاف کر دیا کرنا۔ یہ سوچ کر کہ اس کا باپو اس کے سر پہ نہیں۔ اسے اچھی جگہ بیاہنا جس گھر میں رزق کافی ہو اور آدمی کی عادت ذرا ذرا سی بات میں میں میخ نکالنے والی نہ ہو۔ دلدار سنگھ میری چنتی تیرے سپرد ہے۔"

پھر دادی کی طرف مڑ کر بولا "ماں میں نے جتنا مجھ سے ہو سکا۔ تیری خدمت کی پر کبھی تیرے پیر نہ دبا سکا۔ تیری سیوا ابھی جی بھر کر پھر بھی نہ کر سکا۔"

دادی ماسے چانن سنگھ کے سنبھالتے سنبھالتے گر گئی۔ باپو نے دادی کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنوں پہ رکھ لیا اور اُسے چادر سے ہوا دینے

لگا۔

پھر جانے کا وقت ہو گیا۔ اور دروازے پہ کھڑے سنتری نے ہمیں اطلاع دی۔

"جیتو" تم نے کہا "میں تیرا قرض دار ہوں۔ یہ تو مجھے معاف کر دے۔ ماں کا نیرے اور دلدار سنگھ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کی بیٹوں کی طرح خدمت کرنا۔ زندگی زندگی میں نہ سہی موت کے بعد ہم ضرور ملیں گے۔ اپنی عزت کی حفاظت کرنا۔ تم جوان ہو۔ یہ دیکھ دلدار سنگھ تو اب بڈھا ہو گیا ہے نا" اور ماں نے روتے روتے جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لیئے۔

مجھے آج بھی اپنے باپو کی صورت اسی طرح دکھائی دیتی ہے جب ہم اسے چھوڑ کر آ رہے تھے اور وہ چنتی کو بار بار گلے لگا رہا تھا۔ ماں کے چرن چھو رہا تھا۔ مجھے پیار کر رہا تھا۔ اور ماں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس میں ساری زندگی اور ساری محبتیں ہوں۔ وہ کس حسرت سے ہمیں سدا کے لیئے وداع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم لالڑماں لوٹ آئے۔

اور زندگی کا نیلی دھول میں چھپا ہوا سہنرا راج بھون دھم سے گر گیا اور پھر آہستہ آہستہ بیٹھتی ہوئی دھول مٹی میں مل گئی۔

٭ ٭ ٭

سیندوری پرچھائیں

جب لارہ ال کی گلیوں میں اپنے پراۓ اُتم سنگھ کا ماتم کر رہے تھے اور آس پاس کے دس گاؤں کے لوگ میری بیوہ ماں اور بیوہ دادی کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ عورتیں گھگھرے پہنے چھاتیاں ننگی کئے کھڑی کھڑی باپو کا سیاپا کر رہی تھیں اور ان کے گھونگھٹ درد بھرے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ تب میں نے ہرسنگھ کی بیوی کو اپنی کہاریوں اور نائنوں کے ساتھ چادر اوڑھے بڑے دروازے میں داخل ہوتے اور آنگن میں آکر ایک طرف کھڑے ہوتے دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے چادر اتار دی اور گھونگھٹ کھینچ کر سیاپا کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ باپو کو ایک چادر دے کر سر سے پاؤں تک ڈھانپا ہوا تھا۔ اور مراثن درد بھری آواز میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی

کہ ساری عورتیں بہت زور زور سے اپنے ہاتھ چھاتیوں پہ مارتیں اور رو رہی جاتی تھیں - میری ماں کے مائکے سے اس کی بھابیوں اور ماں کے ساتھ سارا جہاداج پور ہی آگیا تھا - دھیان پور اور سپاری فنڈ کے سرداروں کی بہوئیں اور سردارنیاں، کہارنیاں، ہر یاں کوئی ایسی عورت نہ تھی جو آنسو نہ بہا رہی ہو - جنتی کو ہم نے دلیسو کے گھر اس کی چھوٹی بہن سے کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا - دادی کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں تھا وہ صبح سے اُتم کے پاس بیٹھی گھڑی گھڑی ہاتھ ملتی اور کہتی تھی "اُتم سنگھ سوہنیا اب میں کہاں جاؤں" وہ عورتوں کی طرف دیکھتی اور بار بار ہاتھ مل کر کہتی "اُتم سنگھ پوت میں کہاں جاؤں؟" کبھی کبھار چیخ کر کہتی "میرے گھر میں تم رو کیوں رہی ہو - شور کیوں کر رہی ہو - میرے بیٹے کو سونے دو"

میری ماں نے سویرے سے آنکھ نہ کھولی تھی، اس کے ہونٹ سفید تھے اور وہ باپو کی لاش کے پیروں کی طرف جہاں سویرے گری تھی وہیں پڑی تھی - کسی نے اُسے ہوش میں لانے اور منہ پہ پانی کے چھینٹے مارنے کی کوشش نہ کی تھی - میری نانی نے اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر لہولہان کر لی تھی - مگر کوئی اس کے ہاتھ روکتا اور اُسے منع نہیں کرتا تھا - دکھ کی شدت میں کمی یا زیادتی رشتے کی دوری اور نزدیکی کی وجہ سے ہوتی ہے - نانی کو جوان بیٹی کے ودھوا ہو جانے کا افسوس تھا اور یوں بھی باپو کی موت پہ کس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے سوائے دادی کے - پھر باہر سے ننگے سر ماما چانن سنگھ آیا اور میرا ماما شمشیر سنگھ -

دوپہر ڈھل گئی تھی اور اُتم سنگھ کو شمشان لے جانا تھا۔

اور پھر وہ میرے شیر جیسے باپو کو بے بس جان کر اپنے کندھوں پر اٹھا کر شمشان لے گئے۔ میرا جی چاہتا تھا۔ ایک بار اس کا چہرہ دیکھوں۔ وہ شکل جو پھر کبھی مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ آنکھیں جن کا پیار اور نرمی پھر کسی آنکھ میں میں نے نہ دیکھی۔ عورتیں چھاتیاں پیٹ رہی تھیں۔ گلیوں دو دو چار چار کھڑی رو رہی تھیں یہ ساری رونق میرے باپو کے لئے تھی۔ جس کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ جس دن اسے سیشن کی عدالت سے رہائی کا حکم ملا ہے اس دن دادی اور دھیان پور والے سارے گاؤں سے باہر اُسے لینے گئے تھے۔ اور گلیوں میں ایسی چہل پہل نہ تھی۔ میری دادی کی کمر پان لگتا تھا اور بھی لمبی ہو گئی ہے اور اس کا قد بڑھ گیا ہے اس کے چہرے پر جلال تھا اور باپو کا گلا ہاروں میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی مونچھیں اکڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں غرور کا نشہ تھا۔ اس دن تو ہرسنگھ کی بیوی ہمارے گھر بدھائی دینے نہیں آئی تھی۔ اور سردار ہرسنگھ کی بیٹھک میں لالڑاں کے کئی سردار برادری کے کچھ لوگ اور بھاگو کا باپ یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے گھر میں کوئی مر گیا ہو۔ اس دن سردارنیوں کے گھر کی مہریاں گھڑی گھڑی ہماری گلی کے پھیرے نہیں کرتی تھیں۔

پھر ہرسنگھ نے اپنی سفید گھوڑی پہ چڑھ کر بڑے شہر کے پھیرے کرنے شروع کیئے ہیں تو راہ کی گرد بھی تھک گئی اور آخر میں اس راہ سے جو نہر کے ساتھ ساتھ ہو کر لالڑاں کی گلیوں میں ختم ہوتا ہے۔ لوگ میرے

باپو کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کر میری دادی کے آنگن میں لے آئے۔ جس آنگن میں اُتم سنگھ کے بعد نہ دیئے میں وہ روشنی رہی اور نہ ہی گلیوں میں وہ رونق۔

ٹھیک ہی تو ہے سُکھ میں برادری والے ساتھ نہ دیں پہ دُکھ میں تو ہر کسی کو آنا پڑتا ہے پہ برادری جو ہوئی اور پھر کونسی اُتم سنگھ کی شادی ہو رہی تھی کہ بلانے پہ ہی جاتا ہوتا۔ اور یہی سوچ کر جس دن مجھے پگڑی باندھی گئی ہے۔ سردار مہر سنگھ بھی آیا ہوا تھا۔ میرے ماما اور دھیان پور والے سردار لاڑہ اں کے سارے لوگ اُسے قہر بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ دانت پیس رہے تھے۔ مگر کوئی اُسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس جگہ تمہارا کیا کام ہے۔ یہاں تک کہ ماما جان سنگھ نے بھی دادی سے کہا۔

"کاکی جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ جب تیرا بدلہ لینے والا ابھی کوئی نہیں تو تُو ناحق برادری والوں سے خفا ہوتی ہے ہر بات وقت پر اچھی لگتی ہے۔ میں نہیں کہتا یہ بات جانے دے پہ کم از کم دلدار سنگھ کے جوان ہونے تک کا تو انتظار تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ دشمن اگر گڑ دینے سے مر جائے تو زہر کیوں دیا جائے۔ مہر سنگھ اندر سے کر اُتم سنگھ کا افسوس تجھ سے کرنا چاہتا ہے۔"

دادی نے ماما جان سنگھ کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

"جان ویرا یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ میں تو راکھ بھی ہو جاؤں میری ہڈیاں بھی کوئی سرمہ بنا کر ہوا میں اُڑا دے پہ میں مہر سنگھ سے بدلہ ضرور

لوں گی۔ اُسے یہ ترس نہ آیا کہ انوپ سنگھ نے کونسا مجھے سُکھ دیا تھا جو اُتم سنگھ کو پھانسی دلا کر اس نے کمی پوری کر دی۔ میرے ہاتھ پیر سلامت رہیں۔ مجھے کسی برادری کی ضرورت نہیں۔"

اور بلونت چاچا نے دادی کے سر پہ ہاتھ دھر کر ہوئے ہوئے کچھ باتیں کی تھیں جس پہ دادی نے سر ہلا کر کہا تھا" اچھا تو میں صلح کر لیتی ہوں۔"

اور یوں ہمارے گھروں کا پھر میل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ ہم لوگ سردار مہر سنگھ کے گھر آنے جانے لگے۔ کلدیپ کور مہر سنگھ کی چھوٹی بیٹی اور جنتی میری بہن بہت پکی سہیلیاں بن گئیں۔

گھر میں سب دیبو کہتے تھے وہ اپنے بھائیوں کی لاڈلی اور باپ کی سر چڑھی تھی۔ مگر بڑے گھروں کی لڑکیوں میں جو ایک خواہ مخواہ کی اکڑ ہوتی ہے وہ اس میں نہ تھی۔ ہولے ہولے بات کرنے والی، لمبے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی لال گلابی دیبو جب جنتی کے گڈے سے اپنی گڈیا کا بیاہ رچاتی تو یوں ہی اس کی گڈیا اپنے کندھوں پہ اٹھا کر اپنے گھر لاتا۔ ڈولی پہ سے میں ہی روپے پھینکتا۔ میں سدا اس کی گڈیا کا باپ بنتا۔ میں عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اور وہ جنتی کے برابر تھی۔ مہر سنگھ کی بیوی مجھے کاکا کہتی اور جب جنتی نے کہا "تائی جی یہ دلدار سنگھ دیو ہے" تو سب مہریاں اور کہاریاں زور سے ہنسنے لگیں اور دیبو نے اپنی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کر جیسے چڑانے کے لئے کہا "کیسے دلدار سنگھ

دیپہ کہاں؟ اور چنتی نہ ہانسی ہو گئی۔ پر مجھے سوائے بیاہ شادیوں اور گڑیا کی برات کے اور وقت کہاں ملتا تھا کہ دیپو اور چنتی کے کھیلوں میں شریک ہوتا۔ تاروں کی چھاؤں میں دادی اور میں گھر سے نکلتے اور سانجھ کو جب گھر آتے تو تھکن سے میں اس قدر چور ہوتا کہ روٹی کھائے بنا سو جاتا اور ماں بڑے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر جگاتی اور مشکل سے دودھ کا گلاس پلاتی۔ اب وہ نیندیں کہاں گئیں ؟

ایک ساون خوب کھل کر لگا تھا۔ روز گھٹائیں جھوم کر آتی تھیں اور بارشوں سے پنڈ کے اردگرد کی حویلیوں کی کچی دیواریں ڈھے گئیں اور بڑی نہر کناروں سے اچھلنے لگی۔ لڑکیوں نے دالانوں میں پینگیں ڈالی تھیں۔ اور آنگن میں نیم کے سایوں تلے مست کرنے والی ہوا چل رہی تھی۔ چنتی نے اپنے پیپل کے بڑے ڈال کے ساتھ پینگ ڈالی تھی۔ محلے کی لڑکیاں اس کی سہیلیاں اور مہر سنگھ کی دیپو سب باری باری جھول رہی تھیں۔ دیپو نے گہری پینگوں والا لال اور ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے سیاہ بالوں کی گندھی ہوئی چوٹی پینگ چڑھاتے میں نہ جانے کس طرح رسّے کے ساتھ بل کھا گئی تھی جب اس نے نیچے اترنا چاہا۔ تو گرہیں نہیں کھلتی تھیں۔ پہلے چنتی نے پھر شیر سنگھ کی بلبیر نے اور یہاں تک کہ میری ماں نے بھی کوشش کی۔ مگر دیپو کی چوٹی کھل نہ سکی۔

اس دن میں تہبند اونچا کئے گلیوں کے کیچڑ سے لتھڑے پاؤں جھاڑ نما دادی کے بھتیجے پہ گھر آیا تھا۔ کوئی کام تھا۔ اتنے دنوں کے بعد دلہنیں

پڑتا کہ کیا بات تھی مگر دادی نے کہا تھا "دلدار سنگھ بس بجلی کی طرح جا اور آندھی کی طرح واپس آ۔ میں یہاں تیرا انتظار کرتی ہوں"۔ گھر آیا ہوں تو سب سے پہلے میری نظر دیپو پر پڑی۔ جو بڑی بے بسی سے پینگ کے رسے کے ساتھ لگی رو رہی تھی اور باقی لڑکیاں حیران تھیں۔ اور ہنس رہی تھیں۔ چنتی چپ کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی "دیر میرے سوہنے دیر ذرا ادھر آکر دیپو کا پراندہ تو کھول دے۔ بیچاری نہ جانے کس طرح پینگ کے رسے کے ساتھ لپیٹی گئی ہے"۔ دیپو نے بھی آنکھیں اٹھا کر بڑی منت اور التجا سے میری طرف دیکھا۔ ماں لکھن گرم کر کے گھی بنا رہی تھی۔ دور سے بولی "وے دلدار سنگھ ذرا لڑکی کی چوٹی تو کھول کس طرح رسے سے لپٹ گئی ہے کھلتی ہی نہیں۔ میرے ہاتھوں میں تو ذرا بھی سکت نہیں۔ میں تو ہار گئی ہوں"۔

میں اور دیپو اتنے پاس پاس کھڑے تھے کہ میں اس کے سانس کو اپنے منہ پر لگتے محسوس کر رہا تھا دھرتی میں سے بارش کے بعد ایک سوندھی اور میٹھی سی خوشبو نکلا کرتی تھی۔ یہ سوگندھ تو دیسی بھی نہ تھی انناج کی بہتی ہوئی اور کھیت سے کھیت تک پھیلی باسمتی۔ گنوں کے تازہ رس اور پکتے گڑ، کسی میں ایسی مٹھاس نہ تھی۔ یہ انوکھی خوشبو میرے سانس میں رچ گئی۔ میرے خون میں ایک گرم دھارا سا مل گیا۔ مگر میں نے دیپو کی طرف نہیں دیکھا مجھے معلوم تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور پل پل اس کی اداسی خوشی میں بدلتی گئی ہوگی۔ پہلے اس نے سکھ کا سانس لیا ہوگا۔ پھر اس کی آنکھوں سے وہ یاسی اور منت چھپی ہوئی ہنسی میں ڈھل گئی ہوگی۔ ہر کھلتی گرہ کے

ساتھ اس کے سانس میں خوشبو زیادہ بڑھتی گئی اور وہ مجھ سے دور ہوتی گئی آخری گرہ کھلنے پہ اس نے زور سے کہا "شکریہ" اس کے لال لال پاؤں زمین پہ آ لگے ۔

اور آج بھی مجھے پکا یقین ہے کہ عورت میں ایک خوشبو ہوتی ہے جو بس ایک مرد ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ ایک ایسی خوبصورتی جسے صرف ایک مرد کی آنکھیں زندگی میں صرف ایک بار دیکھ سکتی ہیں ۔ اور پھر وہ ساری لالی جو اس کے گالوں میں ہوتی ہے وہ سیاہی جو اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے وہ چمک جو اس کے بالوں میں ہوتی ہے اس ایک گھڑی میں گھل مل کر اس دوسری زندگی کو اتنا بے چین کر دیتی ہے اور اتنا دکھی کہ نہ تو وہ درد کبھی چھوٹتا ہے اور نہ وہ دکھ کبھی کم ہوتا ہے بلکہ رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے تب لاکھ جتن کرو ۔ لاکھ اپنے آپ کو کام میں لگانے کی کوشش کرو ۔ خاندان کی آن، بدلے کا خیال، اپنی قسم کی یاد اور دادی کی مجبوری، ماں کی بے بسی یہاں تک کہ اپنا اکیلا پن بھی سامنے ہو پھر بھی وہ خوشبو بھلائے نہیں بھول سکتی اور آسیب بن کر شمشان کی آگ تک، یہاں تک کہ موت کے بعد بھی پیچھا کرتی ہے ۔

بس واپس لوٹتا ہوں تو میرے قدم یوں ہلکے پڑ رہے تھے جیسے بس کیچڑ بھری گلیوں میں نہیں پھولوں کی سیج پہ چلتا آیا ہوں ۔ میں گاؤں سے نکل کر تیز بھاگ رہا تھا ۔ جیسے میرے کندھوں پہ پنکھ لگ گئے ہوں ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ زور زور سے گانے لگوں اور اتنا ہنسوں کہ پیٹ

دکھنے لگے۔

جب گاؤں کا میلہ لگا تو چنتی اور دیپو ایک ہی رنگ کی چنریاں اوڑھے رنگین چڑیوں کی طرح خوش خوش گاتی اور ناچتی پھر رہی تھیں۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں اور برادری کی جوان بہوئیں نئے نئے کپڑے رنگ برنگ جوڑے پہنے گھوم رہی تھیں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے دوپٹوں میں گہرے رنگ ڈالے انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے آکاش سے سات رنگوں والی پینگ اتر کر زمین پر چل پھر رہی ہے۔ لالاؤں کے سرداروں کی بڑی بڑی آنکھوں اور اونچے قد والی بہوئیں، ذرا منہ دبا کر ہنستی تھیں۔ نئی دلہنیں لال جوڑے پہنے تھوڑے تھوڑے گھونگھٹ ماتھے تک کھسکائے اپنی نتھوں کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹا کر دوسرے ہاتھ سے چٹنی والے امرود اور تیل میں تلی مرچ مصالحے والی چیزیں کھا رہی تھیں اور مورنیوں کی طرح اٹھلا کر چلتی تھیں۔ مائکے میں آئی لڑکیاں دوپٹوں سے بے خبر آزاد اور بے فکر چار گھڑی سہیلیوں کے گلوں میں باہیں ڈالے اپنے اپنے سسرال اور سرداروں کی باتیں کرتی ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں مہریاں اور کہاریاں، سردارنیوں کے دیئے ہوئے کپڑے پہنے ڈھولک بجاتی اور گیت گاتی پھرتی تھیں چھوٹے چھوٹے لڑکے بہنوں کے پلو پیچھے سے پکڑے گھڑی گھڑی ضد کر کے چیزیں مانگ رہے تھے۔ آدمی تو اس طرف سے گزر نہیں سکتے تھے مگر ہری ہری دوب پہ چرتی بھینسوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے رکھوالے لڑکے آج بھینسوں کو بھول کر اونچے

ٹیلوں پہ چڑھے دُور ہی سے میلے کی بہار دیکھ رہے تھے۔ کئی سوانیاں گھر سے میٹھی روٹیاں پکا کر لائی تھیں اور اب میلے میں بیٹھی کھا رہی تھیں۔

ہوتے ہوتے بادلوں کے پیچھے سے سورج نکل آیا اور برساتوں کی چماسے کی دھوپ ٹک کر پڑنے لگی بھاری جوڑوں میں مٹیاروں کو پسینے آنے لگے اور وہ لال رومال نکال کر سر سے دوپٹوں کو ہٹا کر پسینہ پونچھتیں اور ایک دوسری سے گھنگھرو لگے پنکھے مانگ کر جھل رہی تھیں۔ ناچنے والی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی چوٹیاں کھل گئی تھیں۔ اور دھوپ کے باوجود بھو پھادو پھرتالیوں کی اور زور زور سے ہنستے کی آوازیں جاتے کا ارادہ کرنے والیوں کے دل پھیر دیتیں۔ کالے بادل دھوئیں کی طرح اوپر ہی اوپر چکروں میں اڑنے لگے۔ اور ٹھنڈی ہوا انہیں لا لا اس سے اڑا کر کہیں اور لے گئی۔

چنتی گھر آئی ہے تو بڑی اُداس تھی۔ اس دن میرے پاؤں میں لمبا سا کانٹا چبھ گیا تھا اور دادی نے مجھے کہا تھا کہ میں گھر پہ ہی رہوں۔ چنتی کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ دیپو بھی نہ تھی۔ اور ایشرے کی بہبیر بھی نہیں۔ ماں نے پوچھا۔

"چنتی تجھے کیا ہوا ہے۔ میلے میں کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ کہ دیپو سے خفا ہو گئی ہے تو؟"

پہ اس نے ماں کی کسی بات کا بھی جواب نہ دیا۔ میری طرف منہ کر کے بولی "وہ کیا ہمارے باپو کو دیپو کے باپو نے پھانسی پہ چڑھوایا تھا؟"

میرا سانس سینے میں رکنے لگا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں بولی "کس نے یہ بات کہی ہے تجھ سے؟"

کہنے لگی "آج میری اور ربّو کی لڑائی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ بس تو مجھ سے اور دیپو سے نہ بولا کر۔ اس نے کہا بڑی آئی دیپو کی سہیلی۔ بے شرم کہیں کی تجھے اتنا نہیں پتہ کہ تیرے باپو کو دیپو کے باپو نے پھانسی پر لٹکوایا ہے۔ بہت سہیلی بنتی ہے دیپو کی، بے شرم؟"

"دیدی سچ سچ کہہ اگر اس کے باپو نے میرے باپو کو مروایا تھا تو میں اس سے کبھی نہیں بولوں گی۔ میں اس کی سہیلی نہیں رہوں گی۔ چاہے ہم نے کتنی ہی پکی قسمیں کیوں نہ کھائی ہوں کہ ہم ساری عمر ایک دوسرے کو نہیں چھوڑیں گی۔ پر میں اس سے بالکل نہیں بولوں گی کبھی نہیں!"

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نظروں میں دیپو کی صورت ابھر رہی تھی۔ پھر دھندلی جیسے کوئی شے دھندلی سی نظر آئے مجھے باپو یاد آ رہا تھا جیسے ہم جیل خانے جا کر سدا کے لئے وداع کر آئے تھے، تین سال پہلے کا اپنے آنگن میں سیاپا یاد آ رہا تھا۔ اور دادی کی شکل میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی جس نے کہا تھا "چاہے میری ہڈیاں بھی سرمہ بنا کر ہوا میں اڑا دو مگر میں مہر سنگھ سے بدلہ ضرور لوں گی۔" اور باپو کی بات جب اس نے کہا "عورت کا بدلہ عورت ہو گی۔"

چنتی پھر بولی "ماں تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ دیہ دلدار سنگھ کچھ تو بول۔ یہ بات سچ ہے کہ دیپو کے باپ ہر سنگھ نے میرے باپو کو پھانسی پہ لٹکوایا تھا"

ماں رونے لگی اور زور زور سے بین کرنے لگی۔ میں پریشان ہو گیا۔ اور چنتی گھبرا کر گھر کے دالانوں میں پھرنے اور چیزیں سنبھالنے لگی اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

بہت دنوں کے بعد دیپو ہمارے گھر آئی۔ بڑی اداس اور بہت ڈری ہوئی کہنے لگی۔" چنتی تو میرے ساتھ کیوں نہیں بولتی بکو کی باتیں سب جھوٹ ہیں۔ تو میری پیاری سہیلی ہے میرے ساتھ بول؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

مگر چنتی تو جیسے پتھر کی ہو ذرا بھی تو نہ ہلی اس نے اٹھ کر دیپو کے گلے میں بانہیں نہیں ڈالیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا کہ آخر دیپو نے کیا قصور کیا ہے کہ چنتی اس سے نہیں بولتی۔ چنتی نے سدا کی طرح اُسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا اور نہ ہی ہنس کر دوہری ہوتی ہوئی اُسے اندر کوٹھڑی میں لے گئی۔

پھر دادی نے جیسے اس کی آواز پتھر کے اندر سے نکل رہی ہو گی کہا،" کلدیپ کور گڑیے بیٹھ جا! نی چنتی سہیلی کے ساتھ بول"

اور چنتی نے دادی کی طرف یوں دیکھا جیسے اُسے کھا ہی تو جائے گی۔ اور پھر دیپو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دالان میں لے گئی۔ پر اس بات

کے بعد سے جنتی کا دل دیپو میں کبھی نہ لگا۔ ان کی ہنسی جو دالان میں گونجا کرتی تھی اب مدھم پڑنے لگی۔ میری بہن اب گھر میں ہی رہتی اور ماں کے برابر چرخہ رکھ کر سوت کاتتی یا جب دادی فارغ ہوتی تو اس کے سر میں سے جوئیں نکالتی۔ اس کی باتیں اب بہت کم سنائی دیتیں۔ وہ یکایک بڑی ہو گئی تھی۔ دیپو آتی تو چار گھڑی بیٹھ کر چلی جاتی۔ اور جنتی سے بہت بہت تاکید کرتی کہ "تو ضرور ہمارے گھر آنا تجھے میری قسم ضرور آنا" مگر جنتی ہنس کر رہ جاتی۔ اور ماں کے کہنے کے باوجود کبھی ان کے ہاں نہ جاتی پھر دیپو بھی کم ہی آنے لگی۔ اور اگر آتی تو میں کھیتوں پہ ہوتا اور رات کو کبھی ماں اور کبھی جنتی بتاتیں کہ آج دیپو آئی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمارے یہاں کم ہی کم آیا کرتی تھی۔ دادی بہت شوق سے اس کا ذکر کرتی مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کے ذکر میں دلچسپی ظاہر کروں کہ نہ۔ ورنہ میرا خون تو تیزی سے دل کی طرف جانے لگتا تھا اور کان سرخ ہو جاتے تھے جب کبھی میں دیپو کی بات سنتا۔

پھر ہم نے سنا دیپو کے ویر جو بڑے شہر کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سردار ہر سنگھ پہ زور دے رہے ہیں کہ دیپو کو بھی اسکول میں داخل کر دیا جائے وہ بھی میموں سے پڑھے گی۔ اور کتابوں میں سے نئی نئی باتیں سیکھے گی یہ بات سن کر سوائے جنتی کے سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ دادی بولی "بس اسی بات کی کمی رہ گئی تھی۔ سرداروں کی شان لڑکی کے ان پڑھ رہنے سے بھلا کہیں پوری ہوتی ہے" ماں نے کہا "لالاؤں کی لڑکیاں

میمیں نہ نہیں گی تو سردار ہرسنگھ کس طرح مونچھیں مروڑ کر بیٹھک میں بیٹھے گا۔"

پھر سنا بڑے شہر سے ایک میم ہرسنگھ کے گھر رہنے اور دیپو کو پڑھانے آنے والی ہے۔ تب برادری کے اور پرائے سب لوگ کہنے لگے "سردارنی کرتار کور تو دھیان پور والوں کی بیٹی تھی نا۔ انوپ سنگھ کا دیا ہوا دکھ پی گئی۔ مگر سردارنی پرائی عورت کا دکھ کس طرح سے سہہ سکے گی۔ ولایت کی میمیں عورتیں نہیں ڈائنیں ہوتی ہیں اور چٹکیوں میں مردوں کا دل اپنے ہاتھ میں کر لیتی ہیں۔"

ہر روز نئی نئی باتیں سننے میں آتیں۔ کبھی برادری کی کوئی عورت گھر آ کر ماں سے قصہ کہہ جاتی کبھی پوہ کی سرد راتوں کو مل کر چرخہ کاتنے میں بہو بیٹیاں ایک دوسری سے بات کرتیں پر پورا گاؤں دل تھامے اس میم کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ پھاگن آ گیا۔

میں اور دادی یوں بھی سارا وقت کام میں لگے رہتے تھے۔ کھیتوں میں ہر طرف ہریالی تھی۔ فصلیں کمر کمر اونچی ہو گئیں اور درخت آدھے آدھے اس ہریالی میں ڈوب گئے۔ میں رہٹ چلاتے گادی پہ بیٹھا عجیب عجیب سپنے دیکھتا ایسی باتیں جو نہ ہو سکتی تھیں اور جو کبھی میرے نصیب میں نہ تھیں بیل تھک جاتے اور کھڑے ہو جاتے مگر مجھے خبر نہ ہوتی۔ دادی اگر قریب ہوتی تو آواز دے کر کہتی "دلدار سنگھ! رہٹ کیوں نہیں چلاتا۔ کیا سوچ رہا ہے۔" اور اگر وہ دور ہوتی تو بیلوں کی ڈیں مجھے لگتیں

جو وہ مکھیوں کو اڑانے کے لئے اپنے گرد مارتے، نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

پھر ایک دن شام کو جب دادی دیئے میں تیل ڈال کر بتی بٹ رہی تھی ماں چوکے میں بیٹھی اُپلوں کی آگ پہ روٹیاں پکا رہی تھی اور سیلے اوپلوں کے دھوئیں سے اس کی آنکھوں میں سے پانی نکل رہا تھا۔ چینی چاٹی میں سے ملائی ہٹا کر دودھ کا گلاس نکال رہی تھی کہ گیانی جی کے گھر دے آئے تو ہماری سفید بطخیں کٹ کٹ کر کے بھاگیں، اور دروازے میں کسی کے ہائے ہائے کرنے کی آواز سنائی دی تو میں نے ٹوکے کو ہاتھ سے رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دیپو بطخوں سے ڈرتی سہمی کھڑی تھی۔ نہ آگے جاتی تھی اور نہ ہی پیچھے اور بطخیں اپنے سفید پر پھیلائے گردنیں نیچی کئے اُسے کاٹنے دوڑتی تھیں۔ ہمارے صحن میں دن کی بارش کی وجہ سے پانی اور گوبر اور گائیوں کے موت کی سڑاند بھرا کیچڑ پھیلا تھا۔ صرف پاؤں دھرنے کی جگہ تھی جو شام کے دھندلکے میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ دیپو نے باریک ململ کا جسے دادی مندری کی ململ کہا کرتی تھی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ جس کے کنارے گہرے سبز رنگ کے تھے جیسے پھاگن کی ساری بہار نے مل کر اُسے رنگا ہو۔ میں نے اُسے ایک سال بعد دیکھا تھا اور اس ایک سال میں اُس نے کتنا رنگ نکالا تھا۔ جیسے آم کے جوان پودے کی نرم لچکیلی شاخ ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ شرم سے سُرخ ہو گئی یا یہ شام کی سرخی تھی جو اندھیرے میں بادلوں کے رنگ میں گھلی ابھی تک آسمان پہ کھڑی بھیگی ہوئی زمین کو دیکھ رہی تھی میں نے

اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

پھر دادی کی آواز آئی" دلدار سنگھ، بی بی کلدیپ کور کو اندر لے آ! ذرا پیر سنبھال کر رکھنا بیٹی کہیں گارے میں پھنس نہ جائے۔ یہ خصم کھانے بادل بھی کیا بے وقت آئے۔ بھلا سال کے ان دنوں بھی کبھی برکھا ہوتی ہے؟

میں کلدیپ کور کو راہ بتلانے لگا۔ اور کیچڑ میں اُسے وہ ذرا ذرا سے قدموں کے نشان دکھائی نہ دیئے جہاں جگہ سوکھی تھی۔ جب اس کا ایک پاؤں غلط جگہ پڑ گیا تو اس نے پھر ہائے کی۔ اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دالان میں لاکر چنتی سے کہا "لے بھئی چنت کور تیری سہیلی اُدھر کیچڑ میں پھنس گئی تھی۔ میں اُسے بڑی مشکلوں سے کھینچ کر نکال کے لایا ہوں"۔

دیپو نے مجھے نچی نگاہ سے ہی دیکھا۔ ان آنکھوں میں بجلی ایسی چمک تھی اور مسکان تھی جس کا میٹھا پن نہ جانے کیوں میرے جی کو اداس کر گیا میں اپنی جگہ پر جاکر اسی طرح ٹوکے سے چارہ کترنے لگا۔ ٹوکے کے شور میں مجھے کوئی آواز بھی سنائی نہ دی۔ شام کے نیلے پن میں سُرخی اور اندھیرا ڈوب چکے تھے پچھم کی طرف اکیلا تارا جگمگ کر رہا تھا۔ اور اس کے بعد کئی اور تارے نکل آئے جیسے کسی نے کھیت میں موتی بو دیئے ہوں۔

جب دادی نے مجھے آواز دی کہ آکر روٹی کھالوں تب بھی دیپو

چنتی کے پاس اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکائے دیئے کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ لَو کا کانپتا ہوا عکس اس کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا۔ اور اس کے بال سونے کے لگتے تھے اس کے چہرے پہ خوشی سے بوجھل ایک خوشی تھی جو ہونٹوں کے کناروں سے سُرخ گالوں کی طرف ہولے ہولے پھیلتی اور پھر سمٹ جاتی۔

میں اس کی طرف پیٹھ کر کے پیڑھی پہ بیٹھ گیا۔ ماں نے میرے ہاتھ دھلائے اور روٹی کا تھال اٹھا کر بھاجی والی کٹوری مجھے پکڑا دی۔ مجھے لگتا تھا۔ پشت پہ اس کی نگاہیں دہکتے لوہے کی طرح سرخ ہیں جیسے وہ ہمارانی ہو اور مجھے داغ دے رہی ہو کہ عمر بھر اس کا چاکر رہوں۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی وہ چنتی سے کہہ رہی تھی "اچھا چنتی پھر میں چلتی ہوں۔ سویرے ہی سویرے میں اپنے بڑے ویر کے ساتھ شہر چلی جاؤں گی۔"

دادی نے کہا "اچھا بی بی واہگرو نصیب چنگا کرے۔ پڑھنا کوئی بری بات تو نہیں نا۔ گرنتھ صاحب سمجھنا آجائے گا۔ شبد آپ گا سکے گی۔" اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "اگر اس کا باپو زندہ ہوتا تو میں بھی چنتی کو کچھ خط پتر لکھنے پڑھنے کے قابل کر ہی دیتی۔ پر اس کے سر پہ تو بس اس چھوکے سے ویر کا سایہ ہے۔ واہگرو کرے یہ خیر خیر سے اٹھ کر اپنے سسرال جائے۔"

میرے منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا اور بھاجی کا کٹورہ میرے ہاتھ میں آگ

کا انگارہ بن گیا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے باپو کی صورت دکھائی دی۔ جو کہہ رہی تھی۔ "عورت کا بدلہ عورت ہو گی" "اور جنتی تیری بہن ہے اس کا خیال رکھنا اس کو کسی اچھے گھر بیاہنا۔ میری جنتی تیرے سپرد ہے"

اور تب مجھے پتہ لگا کہ جنتی بیاہنے کے قابل ہو گئی ہے میں دلدار سنگھ ویرہ ہی نہیں اس کے باپ کی جگہ بھی ہوں مجھے ابھی زندگی بھر ان فرضوں کو نبھانا ہے جو باپ کے مرنے سے میرے ذمے لگ گئے ہیں۔ میں نے لمبے گلاس میں سے دو دو گھونٹ کر کے پانی پیا اور روٹی رکھ کر کسی طرف دیکھے بنا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دادی پیچھے سے آوازیں دیتی رہی۔ "دلدار سنگھ وے دلدار، پوت بات تو سن روٹی تو تو نے کھائی ہی نہیں"۔ ماں کی آواز مجھے گلی میں سنائی دیتی رہی۔ "پتہ نہیں کہاں گیا ہے۔ روٹی تو بس دو نوالے کھائے ہیں اس نے"

دوسرے دن میں نے سنا۔ ہو اپنے سب سے بڑے ویرہ جگیندر سنگھ کے ساتھ شہر چلی گئی اور اب پتہ نہیں کب وہاں سے واپس آئے گی۔ لاڑواں کے سرداروں کی یہ پہلی لڑکی تھی جو بڑی نہر کے ساتھ والی راہ پہ اپنے ویرہ کے پیچھے گھوڑی پہ بیٹھ کر اور پھر وہاں سے گاڑی میں بڑے شہر گئی تھی۔ عورتیں کہتیں۔ "سردار مہر سنگھ نے اپنی دیپو کو شہر بھیج دیا ہے وہاں میموں کے ساتھ رہے گی اور ان کی بات کیا کرے گی"۔ کمہاریاں مہریاں کہتیں۔ "واہگرو جانے کپڑے کس طرح کے پہنے گی۔ میں نے تو سنا ہے میمیں تو بہ توبہ ننگی رہتیں ہیں۔ بس صرف ایک کرتا

پہنتی ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں سودائی مائی پہنتی ہے۔ ہائے ہائے کیا مت
ماری گئی ہے جوگندر سنگھ کی۔ بھلا آدمی تو پڑھیں پہ یہ لڑکیوں کو پڑھنے
کی کیا ضرورت ہے؟ گیانی جی سے کچھ شُدھ بُدھ کروا لیتے۔ اتنا ہی شوق
تھا لڑکی کو پڑھانے کا تو میموں سے پڑھانا کیا ضروری ہے"۔ پھر جب ہم
گندم کاٹ رہے تھے اور میں اور دادی سارا سارا دن کھیتوں میں مصروف
رہتے تھے ماں کام کرنے والوں اور دوسرے مدد کروانے والوں چاکروں
اور مزدوری پہ کام کرنے والے چماروں کہاروں کے لئے روٹیاں پکا کر لاتی
اور ہماری بھوری بھینس۔ سفید گائے اور دونوں کالی بھینسوں کے دودھ
کی لسی بھی کم پڑ جاتی۔ شہر سے دیپو کا خط میری بہن چنتی کے نام آیا۔
چنتی نے ناڑ رنگی ہوئی تھی اور پونیاں رکھنے کے لئے چھوٹے
چھوٹے پٹارے بنا رہی تھی جب گاؤں کے مدرسے کا ایک لڑکا آیا اور
کہنے لگا "یہ خط منشی جی نے دیا ہے"۔ چنتی بار بار اُلٹ الٹ کر کاغذ کو دیکھتی
اور رکھ دیتی۔ پھر شام ہو گئی۔ میں اور دادی تھکے ہارے گھر آئے۔ ہمارے
ایک بیل کے پاؤں میں ورم ہو گیا تھا ماں اس کے لئے دوائی گھونٹ رہی
تھی جب چنتی نے ہولے سے میرے پاس آکر کہا "دیر دلدار سنگھ تپہ نہیں
یہ کیسا کاغذ ہے، مدرسے کے منشی جی نے بھیجا ہے ایک لڑکا دے گیا ہے"۔
میں نے کاغذ ہاتھ میں لیا۔ تو میرا دل زور سے دھڑک اٹھا اندر سے کسی نے
کہا یہ اسی ہمارانی کا ہے جس کے تم چاکر ہو۔ میری کمر پہ اس کی نگاہیں بیٹھی
چبھن سے تیر رہی تھیں۔ مجھے شام کے اس نیلے دُھندلکے میں نہ جانے دیپو

کیوں یاد آ رہی تھی ۔

میں روز کی طرح دودھ کا گلاس لئے جب گیانی جی کے گھر پہنچا ہوں
—— تو وہ شبد پڑھ کر دو چار آدمیوں سے باتیں کر رہے تھے ۔ دودھ اندر
پکڑا کر میں بھی وہیں ہو بیٹھا ۔

پھر اُن آدمیوں نے ست سری اکال کیا ۔ جاتے لگے تو مجھ پہ بھی
نظر پڑی کہنے لگے "یہ اپنے اتم سنگھ کا لڑکا دلدار سنگھ تو نہیں ؟"

گیانی جی بولے "بالکل ! بالکل !"

دونوں نے میرے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولے "سکھ سے
جوان ہو گیا ہے یہ تو ، بیچاری دادی کے ساتھ اب کچھ نہ کچھ مدد تو کرواتا ہی
ہو گا نا ۔"

اور گیانی جی بولے "جی دلدار سنگھ جیسے پوت تو وا ہگرو ہر ایک
کو دے ۔ اس نے دادی اور ماں کو ذرا جتنی تکلیف نہیں ہونے دی کبھی ،
شیر پوت ہے شیر ۔" اور انہوں نے میری پیٹھ پہ تھپکی دی ۔

اور پھر جانے والوں نے کہا "بھئی دلدار سنگھ سردار نی کرتار کور کو
ہمارا ست سری اکال کہہ دینا ۔ ہم کسی دن پھر آئیں گے گیانی جی" اور وہ
چلے گئے ۔

میں نے کہا "گیانی جی یہ کاغذ کیسا ہے پڑھ تو دیں ۔"

گیانی جی نے مجھے اندر عینک لانے کے لئے بھیجا ۔ پھر دیا منگوایا اور
بولے "بھئی یہ کلدیپ کور کا پتر ہے ۔ چنت کور کے نام ، کہ وہ سکھ نشانتی سے ہے

اور چھٹیاں ہونے والی ہیں وہ جلدی ہی گھر آئے گی۔ پھر اس نے سب گھر والوں کو ست سری اکال لکھا ہے۔"

مجھے لگا دیے کی روشنی بڑھ کر چاند بن گئی ہے ایسے دیسوں کے سپنے میرے دماغ میں گھوم گئے، جو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ خون میری رگوں میں تیز ہو گیا۔ میں نے جلدی سے گیانی جی سے کاغذ لیا۔ اور گلیوں میں تقریباً بھاگتا ہوا جب اپنے دروازے میں گھسا تھا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں دھپ سے پلنگ پر گر پڑا۔ اور زور سے بولا۔ "چنتی یہ تو دیپو کا خط ہے بڑے شہر سے آیا ہے۔"

دادی نے کہا "کیوں دلدار سنگھ تجھے سانس کیوں چڑھی ہوئی ہے کیا بھاگ کر آیا ہے۔"

میں نے کہا "دادی میاں نچی گلی سے ایک کتا میرے پیچھے بھاگا تھا۔"

چنتی زور زور سے ہنسنے لگی اور بولی "واہ رے یہ بس کتے سے ڈر گئے۔"

اور ماں بولی "نہ جانے کیسا کتا ہو۔ کس زور سے ہنس رہی ہے گھوڑی کی طرح چپ کر۔"

اس دن کا ہفتے کے بعد ہم گیہوں کے پول لگا رہے تھے۔ جب دور نہر کی راہ پر دو چمکتے جسموں والی گھوڑیوں کے ساتھ ساتھ چار دوڑ رہے تھے۔ دادی نے کام کرتے کرتے ہاتھ ماتھے کے اوپر رکھ کر آنکھوں پر زور دے کر ادھر دیکھا اور کہنے لگی "یہ ضرور مہر سنگھ کے گھر کی سواریاں ہیں

سفید گھوڑیاں سارے لالڑاں میں کیا سارے ماجھے میں انوپ سنگھ کے پاس تھیں یا ہر سنگھ کے پاس" اور پھر اس نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے دل کے اندر کوئی شے ٹٹول رہی ہو۔ میں نے گھبرا کر نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور دادی بھی یوں کام میں لگ گئی جیسے دیپو کا گاؤں میں آنا معمولی بات ہو۔

ہوا میں آم کے درختوں کے بور کی خوشبو تھی اور بوہل کی تازہ تازہ سوندھی باس تھی اور پرے نہر کے پانی کی ذرا سی نمی تھی۔ رہٹ چل رہا تھا۔ اور اس کی رُوں رُوں میں مجھے دنیا کے سارے راگوں کے سر ملے ہوئے جان پڑتے تھے۔ راستے میں غبار اڑ رہا تھا جو ڈوبتے سورج کی کرنوں میں سنہرا لگتا تھا۔ لوگ اپنے ڈھور ڈنگر ہانکتے سروں پہ چارے کے گٹھے لادے یا بھینسوں کی پیٹھ پہ رکھے ہوئے گھروں کو جا رہے تھے اور راستے میں ماہیا گاتے جاتے تھے۔ اُن کی آوازیں شام کے دھندلکے اور سنہرے غبار میں لپٹی بادلوں کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی لگتی تھیں اور رات کا سونا پن سورج کی لالی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس وقت جب ہم روٹی کھا کر دیا بجھا چکے تو دادی نے کہا "کیوں دلدار سنگھ پھر وہ بات کس طرح ہو گی؟"

"کون سی بات دادی؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی ہر سنگھ سے بدلہ لینے کی، تو اب خیر سے جوان ہو گیا ہے۔ میں کب تک لالڑاں میں نیچا سر کر کے چلوں گی۔ اور لوگوں کے طعنے برداشت کروں

کوئی راہ سوچ "۔

" اچھا دادی !"

اور پھر ساری رات میں بُرے بُرے سپنے دیکھتا رہا۔ میری آتما نہ جانے کیوں اتنی بے چین تھی۔ دیپو کا لاڈ اس آ گئی تھی اور پھر بھی میرا جی مندا تھا۔ آخر کیا ہو رہا تھا مجھے؟

دوسرے دن دادی کھیت پر کسی بیوپاری سے بھاؤ کر رہی تھی۔ جب میں اُسے چھوڑ کر کسی بہانے گھر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا دیپو آئی ہے تو چنتی سے ملنے دوپہر سے پہلے ہی آئے گی۔ راہ میں ماں مجھے روٹی لے جاتی ملی۔ اس نے درخت کے سائے میں بیٹھ کر مجھے لسی کا گلاس پلا یا اور پوچھنے لگی " کیوں دلدار سنگھ گھر کس لیے جا رہا ہے ؟"

میں نے بہانہ کر کے اُسے بھی ٹال دیا۔ گھر میں گھسا تو دیپو اکیلی دالان میں بیٹھی تھی۔

میں نے کہا " ست سری اکال۔ چنتی کہاں ہے ؟"

بولی " میں نے جھری کو اُسے بلانے بھیجا ہے، میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ ادھر بلّو کے گھر سے اس کی آواز آ رہی ہے اکیلی ہو گی نا۔ بلّو کے پاس چلی گئی ہو گی "

میں نے کہا " تمہاری اور بلّو کی تو لڑائی ہو گئی تھی، کہو اب صلح ہوئی کہ نہیں ؟"

وہ شرم سے سرخ ہو گئی اور بولی " وہ تو کئی سال پہلے کی بات

ہے کہیں سہیلیاں بھی لڑا کرتی ہیں کبھی؟"

پھر میں نے بلّو کو اور چنتی کو مہری کے آگے آگے آنگن میں گھستے دیکھا۔ وہ تیزی سے آکر دیپو سے لپٹ گئیں۔ چنتی نے ہنستے ہوئے گھوم کر مجھے پوچھا "کیوں دیر اس وقت تو کس طرح آیا ہے کوئی کام ہے کیا"؟

میں نے کہا "مجھے باپو والی درانتی لاکر دے"۔

چنتی ہنستے ہنستے چپ ہو گئی اور دیپو اتنی زرد ہو گئی مانو اس میں لہو کی ایک بوند بھی نہ ہو۔

پھر بلّو نے کہا "دلدار سنگھ فصلیں تو کاٹی گئیں میرے باپو نے درانتیاں لاکر کوٹھی میں رکھ دی ہیں، تو کس لئے درانتی مانگ رہا ہے"؟

پھر چنتی اور بلّو اندر جاکر جلدی جلدی درانتی ڈھونڈنے لگیں۔ مہری واپس چلی گئی۔ میں اور دیپو دالان میں اکیلے رہ گئے۔

اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سفید تھے۔ اور وہ پلنگ پر یوں بیٹھی تھی جیسے اب گری کہ گری۔ ان دو تین مہینوں کے عرصے میں اس کی آنکھیں اور بڑی ہو گئی تھیں اور بالوں میں چمک اور زیادہ آگئی تھی۔ جیسے پکنے پر رسے ہوئے آم میں ہوتی ہے۔ اس نے بڑی خوبصورت جوتی پہن رکھی تھی۔ جس میں سے اس کے سفید پاؤں اور سُرخ ایڑیاں اور اچھی لگتی تھیں۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا پلکیں آنکھوں پر جھکائے وہ دوپٹے کا کونہ مروڑ رہی تھی اور کوٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی پلکوں کی جھالر اس کے زرد چہرے پہ بادل کی سیاہی کا ذرا سا ٹکڑا لگتی تھی۔

میں نے زور سے کہا، "جنتی مجھے جلدی جانا ہے درانتی لاکر دے"
انسان کتنا بہروپیا ہے حالانکہ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ وہاں سے کبھی نہ جاؤں۔
دیپو نے وہ سیاہ جھالا اٹھا کر ہولے ہولے میری طرف جھانکا۔
جیسے کوئی مہارانی اپنے جھروکے میں سے کسی چاکر کی طرف دیکھے۔ پھر اس
نے بھی بلّو کی طرح پوچھا ——— آجکل تو بول لگ رہے ہیں۔ تجھے
کیوں درانتی کی ضرورت آپڑی؟

میں نے کہا "ہماری درانتیوں کے دندلنے تیز نہیں ہیں۔
میں نے کل شام کھوہ سے آتے ہوئے مامے کیشو کی دکان پر دے دی
تھیں"

اندر سے جنتی اور بلّو آئیں۔ جنتی کے ہاتھ میں درانتی تھی اور
آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اس نے دیپو کی طرف دیکھے بنا مجھے
کہا "دیرے یہ باپو کی درانتی ہے"۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں غصے اور
دکھ سے آنسو آگئے۔

اس کے بعد جنتی نے دیپو سے بولنا بالکل چھوڑ دیا۔ جس دکھ
کو ہم پہلے برداشت کر چکے تھے۔ وہ اب اس کے لئے نیا ہو کر جاگ
رہا تھا۔ وہ کسی سے بھی نہ بولتی۔ مٹی کی مورت بنی چرخہ کاتتی یا ناڑے کی
ٹماریاں بناتی رہتی یا چپ چاپ بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ اگر اس
کی سہیلیاں اسے کھینچ کر لے جاتیں تو بے بسوں کی طرح کھنچی چلی جاتی پر
وہاں بھی ہنستی بولتی کم ہی تھی۔ رات کو گاؤں سے باہر ساری بہو بیٹیاں

ناچتیں اور اودھم مچاتیں اور یہی بات کرتیں کہ دیپو میموں کے سکول میں پڑھتی ہے نا اس لیے چنتی سے نہیں بولتی

ایک کہتی ــــ "پڑھی لکھی ہے نا مزاج بڑے ہو گئے ہیں"۔

پھر ہونے ہونے لڑکیاں کہتیں "اسے کیا پتہ ہے کہ اس کے باپو کو سردار ہر سنگھ نے پھانسی کروائی ہے اب پتہ چلا ہو گا۔ بس دیپو سے بولنا چھوڑ دیا اس نے"۔

چنتی سے پوچھتیں تو وہ کہتی "کوئی بات نہیں۔ نہ اس کے مزاج ہو گئے ہیں نہ مجھے کسی بات کا دکھ ہے بس یونہی ذرا سی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی تھی، تم لوگوں کو کیا؟"

رات کو دیپو بھی باہر آتی اور چنتی بھی، مگر دونوں دور دور رہتیں۔ جیسے ایک دوسرے کے دل کے چور کو جانتی ہوں۔

اور انہیں دونوں ہر رات سونے سے پہلے دادی کہتی "کیوں دلدار سنگھ کوئی بات سوچی تو نے؟" اور میں کہتا "سوچ لیں گے" دل ہی دل میں سوچتا ایک عمر پڑی ہے حساب کتاب چکانے کو۔

جب میں نے چوری چوری دیپو سے ملنا شروع کیا ہے تو بیساکھ کے دن بیت چکے تھے اب میں شام پڑے گھر سے باہر نکل جاتا۔ میرے ہم عمر لڑکے ایک دوسرے سے مذاق کرتے، گھونٹ گھونٹ شراب چرا کر پیتے اور لڑکیوں کی باتیں کرتے، ایسی باتیں جن میں کھٹی اور کچی کیریوں کا مزا ہو اور زیادہ کھانے سے دانت کھٹے ہوتے ہیں۔

ان کے گھر کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا باغ تھا جس میں پیپل کے گھنے درخت کے پاس چھوٹے چھوٹے امرودوں کے درخت، آموں کے اچھے پودوں کے بوٹے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں جاتا تو سو طرح کی خوشبوئیں کس کس ڈھنگ کی نئی نئی باس سے میرے دماغ کو نشے سے بھر دیتیں۔ میں نے شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ صبح سے شام تک میں بہت محنت سے کام کرتا تھا۔ اور دادی کا سب کہا کرتا تھا۔ میں کبھی اماوس نہانے نہیں گیا۔ میں نے کبھی رات کو ہو۔ ہو کر کے اپنے ساتھیوں کو نہیں ڈرایا۔ مجھے ان باتوں کا ہوش کہاں تھا۔ میں تو دیپو کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ ایسے میں بھلا ایک آدمی اور کیا کر سکتا ہے؟

اس کے گھر کے پچھواڑے باغ میں جا کر اس سے ملنا مجھے معلوم ہے موت تھی اگر کبھی سردار کو پتہ چل جاتا تو چھوی سے میرا سر اُدھر دور پڑا ہوتا۔ ماں اور دادی کا کوئی سہارا نہ رہتا۔ اور مجھے چنتی کو بیاہنا تھا باپو کا بدلہ لینا تھا تاکہ لالڑاں کی گلیوں میں ہمارا سر اونچا ہو سکے۔ سر اونچے ہونے کا مطلب یہی ہے نا کہ ماں کو اور دادی کو اور سب سے زیادہ میری بہن چنتی کو میرے سور بیر بہادر ہونے میں یقین ہو جائے۔ مجھے اس یقین کو حاصل کرنا تھا اور دوسری طرف دیپو تھی ان راتوں میں مجھے لگتا زندگی کی راہ پر صرف ایک دیا جل رہا ہے اگر یہ بجھ گیا تو میں سدا کے لیئے اندھیرے میں رہوں گا۔ موت سے بھی زیادہ تاریک خاموش اور پُر ہول اندھیرے میں۔

ان دنوں دادی کتنے غور سے میری شکل دیکھتی، میرے کیس بیر

کرتا سونگھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ ہولے ہولے میرے دل میں اترنا چاہتی ہے اس کی نگاہ کوئی یقین، کوئی بات، کوئی سوچ ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ وہ کوئی امید، کوئی سہارا اور سر اونچا کر کے چلنے کا ذریعہ تلاش کر رہی ہے دیپو سے مل کر آنے کے بعد مجھے نیند کہاں آیا کرتی تھی ساری رات ہڈیوں میں درد ہوتا رہتا۔ جیسے سرسر کر کے کوئی شے دل کے قریب سے چل کر ہر وقت جسم کے اندر رینگتی رہے اس میٹھے درد سے میں بہت بے چین ہو جاتا۔

دیپو سدا سرخ کھدر کی چنری اوڑھ کر آتی۔ میں کہتا کلدیپ کور تو مندری کی ململ کے دوپٹے کیوں نہیں اوڑھتی تو وہ صرف مسکرا دیتی اور اپنی لمبی سیاہ پلکیں اٹھا کر آنکھوں میں چھپی اُن بجلیوں کو مجھ پہ چھوڑ دیتی۔ آج وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں۔ یہ ہم باتیں کیا کرتے تھے؟

ننگے پیروں سے اونچی گھاس میں کھڑے ہم چنتی کی اور دادی کی باتیں کرتے۔

وہ کہتی "چنتی مجھے بڑی پیاری ہے"؟

میں کہتا "چنتی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے اتنی پیاری کہ میں اگر میرے بس میں ہو تو اس کے لیے آکاش کے تارے بھی توڑ کر لے آؤں۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ایک طرح سے تو وہ میری بیٹی ہی ہے"

دیپو ہولے ہولے ہنس کر کہتی "اچھا تو تم چنتی کے باپو ہو" اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی "بڑے اچھے نصیب ہیں اس کے"۔

میں کہتا "نہیں لالہ داں کی مہارانی تم سے اچھے نصیب نہیں ہیں

پہ میں اس کے لئے جو کچھ کر سکا کروں گا"

اور دیپو دوبارہ کہتی "جس کے لئے تم کچھ کرو گے اس کے نصیب اچھے ہی ہوں گے نا!"

ایک دفعہ کہنے لگی "دلدار پڑھنا کیوں نہیں سیکھ لیتے"

میں نے کہا "کیوں میں شہر کا بابو کیوں بن جاؤں"

کئی پوہ آئے اور کئی لمبی چاندنی راتیں گئیں۔ جنتی کو بیاہ کر ہم لوگوں نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ دادی کا بوجھ کچھ کم ہوا اس کے سسرال والے کھرے میں تھے۔ لڑکا خاصا کھاتا پیتا اور بڑی غریب طبیعت کا تھا۔ گھر میں جنتی کے نہ ہونے کے کارن ذرا بھی رونق نہ ہوتی اور ماں بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی میں دیکھتا اتنے کم سالوں میں اس کا سر سفید بالوں سے بھر گیا تھا اور چہرے پہ وہ رونق نہیں رہی۔ پھر اور عورتوں کو دیکھتا جو ماں سے بڑی تھیں۔ پر پھر ڈھٹر کرتی کپاس کی طرح سفید اور کونجوں کی طرح جوان تھیں۔ دادی کے چہرے پہ اتنے سالوں میں جھریاں لٹک آئی تھیں اور اتنے سالوں میں وہ بہت بوڑھی لگنے لگی تھی۔ لالڑاں کی گلیوں میں سے ہل لے کر گزرتی تو بس گزرتی چلی جاتی رک کر اور عورتوں کی طرح کبھی گلی میں باتیں نہ کرتی۔ جیسے جیسے میں جوان ہوتا گیا۔ دادی میرے چہرے میری حرکتوں میں جیسے تسلی کے نشان ڈھونڈتی رہی۔ دن گزرتے راتیں گزرتیں اپر ہمارے گھر سے نہ کوئی گیت سنائی دیتا اور نہ ہی کوئی دلتی میلہ ہوتا۔ میرے بیاہ کی بات گھر میں نہ ہوتی۔ دادی نہ جانے کس بات

کا انتظار کر رہی تھی۔ کس آسرے وقت گزار رہی تھی کبھی کبھار میں اس کی طرف دیکھتا جیسے وہ مرنے والے کی طرح کسی خاص گھڑی کی راہ دیکھ رہی ہو۔ اور پوہ کی لمبی راتوں میں کھیتوں کو پانی لگا کر جب میں پچھواڑے کے باغ میں جاتا تو دیپو اکیلی کھیتوں میں آجاتی اور میرا سانس سینے میں گھٹنے لگتا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی تیز ہوا میں صرف کھدر کی ایک چنری اوڑھے جو کسی کہاری کی ہوتی وہ ہنس دیتی اور تاروں کی مدہم روشنی میں اس کے دانتوں کی لڑیاں چمک اٹھتیں چاہے کتنی ہی اندھیری رات ہو۔ اس کی آنکھیں کسی اندرونی روشنی سے چمکتی رہتیں اور پھر میں حالات کے دھارے پہ بے بس تنکے کی طرح بہنے لگا۔ میں نے اس سے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا کہ اب کیا ہوگا؟ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

ایک دوسرے میں وشواس ہی ہوتا ہے، پیار میں اور کیا یقین ہو سکتا ہے بھلا۔ مجھے یقین تھا کہ چاہے بارش اور کتنی تیز ہوا چلے وہ جب تک لازماں میں ہے آئے گی ضرور۔

میں بات بے بات ہنس دیتا۔ میرا جی ان جانے ہی ہوا پہ خوشبو کی طرح اڑتا رہتا۔ میرے دوست پوچھتے "یار دلدار سنگھ کیا بات ہے؟" ان دنوں اور راتوں میں میں نے دس دس آدمیوں کا کام کیا ہے۔ ڈر، خوف تھکن سب دکھ مجھ سے ڈرتے تھے۔ مجھ میں ان جانے ہی

طاقت آ گئی تھی - میری زندگی ایک گیت بن گئی تھی - اور میری زندگی
کی راتیں کبھی اندھیری نہ رہتیں - دیپو نے کبھی یہ شکایت نہ کی کہ میں
کیوں اس کے باغ کے پچھواڑے نہیں آتا - ہم دونوں کنول میں بند
راجکمار اور راجکماری تھے - جن کے لئے ساری دنیا ایک کہانی تھی - پھول
پہ اڑنے والے دو بھونرے جو اچانک پھول کے اندر قید ہو گئے ہوں خوشبو
میں اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے -

پھر دیپو کے لئے پیغام آنے لگے - اور وزن کھیڑے، راستے
والا، کانیاں سب جگہ کے سرداروں نے اس لڑکی کو اپنے گھروں کی روشنائی
کے لئے لینے کی جد و جہد شروع کی - دیپو شہر کے اسکول سے گھر آ گئی
تھی اور دن کے وقت بہت کم کہیں آتی جاتی تھی - مجھے اور اسے
اپنے اپنے مقدر کا فیصلہ معلوم تھا - اور کبھی کبھار اس سے باتیں
کرتے، باپو کی صورت میری نظروں میں پھر جاتی - پر میری راہ
الجھی ہوئی تھی - دادی کی منتظر نگاہوں اور ماں کی بے بسی کے باوجود
مجھے کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی - راستے پر دیپو بھی کھڑی تھی - اور
آگے پیچھے کی ساری دنیا ایک سپنے میں دیکھی بات لگتی تھی -

اس رات بھی ہم دونوں ملے - اور آموں کی خوشبو ہمارے
گرد اڑتی رہی تھی - جس دن وزن کھیڑے والوں کا پیغام مہر سنگھ
نے قبول کر لیا تھا - اور وزن کھیڑے سے مٹھائی لے کر دیپو کی ہونے
والی ساس رتھ میں لاد کر آئی تھی اس نے وہ انگوٹھی پہن رکھی

تھی جو ساس نے اُسے پہنائی تھی۔ وہ خوش نہ تھی، اداس بھی نہ تھی۔ ہم روز کی طرح چنتی کی باتیں کر رہے تھے۔ چنتی کا بچہ بڑا پیارا تھا ماں اُسے دیکھ کر آئی تھی۔ درخت کے تنے سے لگی کھڑی وہ مجھے ایک بیل لگتی تھی جس میں نہ کبھی پھول لگیں گے۔ اور نہ کبھی اس سے آگے بڑھے گی۔ میں نے کہا "دیپو آج سے بعد ہم نہیں ملیں گے۔ اب تمہارے اور میرے راستے الگ ہو گئے ہیں۔ سمجھ لو جیسے میں نہر کی پٹڑی سے اتر کر سپاری ونڈ کی طرف مڑ گیا ہوں اور تم لاڑاں میں آ گئی ہو"

دیپو نے پہلی بار اور آخری بار بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی "کیوں دلدار کیا بات ہو گئی ہے۔ ایک مندری کی کیا بات ہے"۔ اور اس نے انگوٹھی اتار کر میرے پاؤں میں پھینک دی۔

میں نے انگوٹھی اٹھا کر اُسے دے دی۔ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پوہ کی سرد راتوں اور چاندنی راتوں کے حسن خوشبو سے بھرے باغوں کے اندھیروں سے پرے میری اور اس کی انگلیاں چھو گئیں۔ اور اس گھڑی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آگ ساری عمر میری رگوں میں تیرتی رہے گی۔

میں نے کہا "ایک انگوٹھی تو کچھ نہیں پر اس بول کی بات ہے۔ تمہیں اس قول کا پالن کرنا ہے جو تمہارے لیئے تمہارے باپو نے

دیا ہے۔ سردار ہر سنگھ نے جس کی اونچی اور سفید گھوڑیاں مشہور ہیں۔ جو تہمند کے لڑ اتنے چھوڑتا ہے کہ زمین کو چھو لیں۔" اور اس گھڑی مجھے پہلی بار یوں لگا جیسے کسی نے برچھی میرے کلیجے میں ماری ہو۔ میرے باپ کا قول اور میری قسم ہے واہگرو" میں نے دل ہی دل میں دعا کی "مجھے ہمت دے کوئی راہ دکھا۔"

جتنی دیر ہم کھڑے رہے دیپو اپنی انگلی میں انگوٹھی گھماتی درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی رہی جاتے جاتے کہنے لگی "اچھا دلدار سنگھ میں اپنے باپو کے قول کا پالن کروں گی۔ اب تو خوش ہے"

اور اس کے بعد میری زندگی کی راہ کا آخری دیا بھی بجھ گیا۔ میرا سر اونچا تھا۔ پر دل کی جگہ خالی تھی۔ سردار ہر سنگھ کی حویلی کے سامنے سے گزرتا تو لگتا پیپل کے پتے ہولے ہولے رو رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ مسافر تھوڑی دیر تو ٹھہر جا ایسی کیا جلدی ہے؟

گاؤں کی گلیوں میں شمشان کی سی خاموشی ہوتی۔ جینتی آئی تو مجھے دیکھ کر بیچ آنگن کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور پھر مجھ سے لپٹ کر اتنا روئی، اتنا روئی کہ میں ڈر گیا، اس کا گبھرو جوان خاوند نیچی آنکھیں کیے یوں کھڑا تھا گویا اس نے کوئی قصور کیا ہو۔ ماں بولی "جینتی کوئی عقل کر دنیا کی ساری لڑکیاں ہی سسرال جاتی ہیں۔ وداع ہوتی ہیں۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ رب خیر کرے، کڑیے تو تے تو میرا دل دھڑکا دیا ہے۔ کیا بات ہے" پر جینتی روتی جاتی تھی۔ اور دلیپ سنگھ کبھی اپنے

کنبھے کی طرف دیکھتا کبھی ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدلتا تھا۔ میں بھی حیران تھا۔

بچہ زور زور سے رونے لگا۔ تو اس نے مجھے چھوڑا اور آنکھیں پونچھتی ہوئی دالان کی طرف چلی گئی۔ جیسے مجھ سے جھڑکیاں کھانے کے بعد کبھی کبھی جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پھر رونے لگی۔ اور ہچکیوں کے درمیان کہتی گئی "کیا بات ہے دیپو تو اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے؟"

ماں بڑی مردہ سی ہنسی ہنس کر بولی "شاباش: بھلا یہ کوئی رونے کی بات ہے جو تو نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ اکیلا کام کرنے والا ہے گرمی سردی کا اثر ہوتا ہی ہے۔ آخر پتھر تو نہیں نا۔ یہ تو کوئی رونے کی بات نہ تھی"

پھر ماں نے دلیپ سنگھ کو پھولوں والا کھیس نکال کر بچھا دیا اور اُسے پنکھا جھلنے لگی۔

دادی آئی تو کہنے لگی "اچھا ہوا چنتی تو آ گئی ہے کڑیے آج سے تیسرے دن دیپو کا بیاہ ہے تجھے بھی تو بلاوا گیا ہو گا نا؟"

اور چنتی نے پہلی بار کچھ سمجھتے ہوئے اتنی گہری نگاہوں سے دیکھا کہ میں پریشان ہو گیا۔ پھر دادی نے مانو بڑے ہی دکھی دل سے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور گڑ کا شربت بنانے لگی۔ ماں نے تنور میں اُپلے ڈالے اور دال میں گھی ڈال کر اُسے گرم کیا۔ میں نے دھیان بٹانے کے لئے چنتی کے بچے کو اٹھا لیا اور اسے سر سے اوپر ہوا اچھالنے لگا۔ بچہ زور زور سے ہنستا اور کھل کھل کرتا سب اس کی طرف دیکھتے۔

جس دن وزن کھیڑے سے برات آنے والی تھی اس سے دو دن پہلے ہی بلونت گھر سجنا شروع ہو گیا۔ ہرسنگھ اور برادری والے سارے سردار انتظام میں لگے تھے۔ حاکم سنگھ وزن کھیڑے میں سب سے تگڑا جوان اور ولایت کا پڑھا ہوا تھا۔ اس کے کئی پڑھے لکھے دوست بھی آنے والے تھے۔ اس لئے بندوبست دوہرا تھا۔ پتلونیں پہننے والوں کے لئے میز کرسیاں بڑے شہر سے گڈوں پہ لد کر آئیں آس پاس کے شہروں سے ولائتی اچھی سے اچھی شراب لا کر رکھی گئی۔ دُور دُور سے اچھے سے اچھا کھانا پکانے والے بلائے گئے سارے گاؤں کی گلیوں میں صفائی کی گئی۔ چھڑکاؤ کیا گیا۔ ہرسنگھ کی حویلی کی طرف آنے والی راہ پر جو گھر تھے انہیں ہرسنگھ نے خود نئے سرے سے لپوایا۔ لالاماں یوں لگتا تھا جیسے آکاش کا ایک خواب ہو۔ جو دھرتی پر اتر رہا ہے۔ حویلی میں سارا دن ڈھولک بجتی رہتی اور سارے گاؤں کی لڑکیاں دیپو کے بیاہ کی خوشی میں چڑیوں کی طرح چہکتی پھرتیں۔ کہاریاں بڑی شان سے نئے نئے کپڑے پہنے تھال لئے گاؤں میں بھاجی اور کھانا بانٹتی پھرتیں۔

پتہ جانے کیوں دادی ان دنوں اتنی بیمار ہو گئی کہ ہل بھی نہ سکتی تھی اور چننی نے اس کی پٹی جو پکڑی ہے تو دیپو کی برات آ گئی مگر وہ اس کے گھر نہ جا سکی۔

سویرے سویرے وزن کھیڑے سے آنے والی راہ پہ باجے کی آواز سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ آکاش سے اتری اور پھر چھن چھن کرتی

مورنیوں کی طرح اٹھلاتی اونٹنیاں، گھوڑیوں سے اونچی، سجی سجائی بڑے ناز سے قدم دھرتیں باجے کی آواز پہ مست اور ناچنے کو تیار قطار باندھے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے اس راہ پہ آئیں اور ان پہ سوار کنٹھوں والے مست آنکھوں والے بانکی پگڑیوں والے سردار تھے جو اونٹنیوں کے ہر قدم پہ جھول جھول جاتے تھے۔ باجے کی آواز پہ ان کے دل میں پسینے کروٹیں لیتے تھے۔ گھوڑیوں کے گلوں میں زیور تھے جو چڑھتی دھوپ میں دمک رہے تھے۔ اور گھوڑیاں آنکھیں بند کر کے باجے سنتی آگے بڑھ رہی تھیں ایک ایک قدم تول تول کر رکھتیں جیسے دریا کے پار اتر رہی ہوں۔ اور پھر رتھوں کی قطاریں تھیں جن میں دلہن کھڑے کی سردارنیاں تھیں اور گھنگرو لگے پردوں کو اٹھا اٹھا کر جھانکتی تھیں اور حیران ہو رہی تھیں کہ وہ کس گاؤں میں آئی ہیں جہاں کی زمین پہ دھول نہیں اور جس کے راہوں پہ کیچڑ اور گڑھے نہیں ہیں۔

مجھے یوں لگا جیسے کوئی دل کو دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے مسل رہا ہو۔ میرے دل میں دیپو کا نام نہ تھا۔ یہاں تک کہ کوئی یاد بھی نہ تھی۔ کیونکہ میں دیسی شراب کی بوتل لیے اپنے کھیت کے کنارے بیٹھا تھا دور تک سرسوں کے کھیتوں کی زردی تھی اور پھر وہی کمر کمر تک ڈوبے ہوئے درختوں کے پتوں پہ کیڑے کی طرح رینگتے ہوا کے جھونکے تھے۔ اس لمحے میرے جی میں آئی کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں پھاگن کی ہوا کا ایک جھونکا ہوتا۔ کسی کھیت کے کنارے ٹھہر کر وہاں سے گزر جاتا تو یہ درد سا جو رہ

کہ میرے سینے میں اٹھ رہا ہے۔ اور کڑوی شراب کی تلخی جو میرے حلق میں کانٹے چبھو رہی ہے۔ جیسے کیکر کا سخت اور تکلیف دیتے والا کانٹا کہ نکالے نہیں نکلتا۔ مجھے یوں تکلیف نہ دیتا۔

باجوں کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔ میں سارا دن ایک پیپل کی چھاؤں میں بیٹھا شراب پیتا رہا۔ میرے دل سے سارے غم ڈھل گئے۔ صرف اتنا یاد رہا کہ گاؤں میں کوئی کسی قول کا پالن کر رہا ہے آج چھوٹے چھوٹے رکھوالے ڈھور کے گائیوں بھینسوں کو چھوڑ کر گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے ایک لڑکا میرے پاس آکر بولا "بھاٹو اگر تو نے سردار ہر سنگھ کی لڑکی کی برات نہ دیکھنی ہو تو ذرا میری گائیوں کا دھیان رکھنا۔ میں بھی چار گھڑی رونق دیکھ آؤں"

اُس قول کا پالن کرتا میں دن ڈھلے تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر راستے پہ باجے اور نائینوں کے پاؤں کے گھنگرو بجتے۔ گھوڑیوں پہ بیٹھے سرداروں کے کنٹھے اور کنگن چمکتے تھے اور چمک یوں پڑتی تھی جیسے سورج ٹوٹ گیا ہو اور ذرا ذرا سی کرچوں میں بٹ کر وزن کھیڑے والوں کے کنگنوں اور کنٹھوں میں آن لگا ہو۔ آگے آگے ایک رتھ تھا۔ سُرخ پردے ہلکے ہلکے اڑ رہے تھے اور جس کے آگے جُتے سفید بیلوں کے سینگوں پر سنگوٹیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ جیسی پوہ کی اندھیری رات میں آسمان پہ آنکھیں جھپکاتے تارے۔ چھم چھم چھم روپوں پونڈوں کی بارش ہو رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں گاتی ہوئی پیچھے پیچھے آ رہی تھیں اور سُرخ پردوں والی رتھ پہ سے

ڈرن کھیڑے والے مینہ کی طرح پونڈوں کی بارش کر رہے تھے۔ پھر گڈوں کی قطاریں تھیں۔ جن میں سامان تھا۔ اور آخر میں نہر سنگھ سفید گھوڑیوں والے کی دی ہوئی گھوڑیاں اور گائیں بھینسیں تھیں اور ولایت سے منگوائی ہوئی حاکم سنگھ کے لئے ایک موٹر تھی۔ جس کو کھلے گڈے پہ رکھا گیا تھا تاکہ راہ کی گرد سے خراب نہ ہو جائے۔

ہولے ہولے یہ قافلہ نہر کے ساتھ ساتھ جانے والی راہ پر مڑ گیا باجوں کی آواز اڑتے والے غبار میں مل کر اور دور ہوتی گئی اور پھر سیندوری پرچھائیں درختوں کے نیچے نیچے ہو کر اپنے گاؤں کو واپس آنے لگے۔ پیچھے لڑکے کہار، چمار ابھی تک راہ کی خاک میں ڈرن کھیڑے والوں کے پونڈ ڈھونڈھ رہے تھے۔ سورج کی لالی ہوا کے ساتھ ساتھ تیزی سے چکروں میں گھوم رہی تھی۔ یہ ساری سرخی اکٹھی ہو کر جیسے نہر میں گھل گئی اور پانی اتنا سرخ ہو گیا جیسے کسی کا خون ہو۔

میں زور زور سے گیتوں کے آدھے آدھے ٹکڑے ایک ایک بول گا رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی تو ڈھنگ سے یاد نہیں آتا تھا۔ مگر میں چپ نہیں ہوتا تھا۔ میرے گلے سے گیتوں کا راگوں کا وہ دھارا بہنے لگا۔ جو برات والوں کے باجوں میں سے نہیں نکلا تھا۔ باجے بے سرے تھے۔ اکتم تار تو مالو میرے پاس تھا۔ اور میں نے بڑی کنجوسی سے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ جب قافلہ تمام کی سرخی میں بہت دور چلا گیا اور باجوں کی آواز ٹنڈوں کی چھ چھ میں گم ہو گئی تو میں نے جی ہی جی میں ہنستے ہوئے وہ اکتم تار نکالا اور اس کی لے میں مجھے

یوں لگا جیسے میرا اپنا آپ گھل جائے گا۔ میں اس سیلاب میں بہہ جاؤں گا۔ قدم ایک بار اکھڑ گئے تو پھر اوپر ہی اوپر لہریں مجھے کبھی ایک کنارے سے ٹکرا دیں گی۔ اور کبھی دوسرے سے۔ مجھے کبھی ایک تنکے کا سہارا بھی نہ مل سکے گا کہ میں ڈوبنے سے بچ سکوں۔ لہریں مجھے کپاس کی طرح دھنک کر رکھ دیں گی۔ میں جھاگ بن جاؤں گا۔ آگے ہی آگے نہ جانے کہاں سے کہاں چلا جاؤں اس دیس میں جہاں سے سیندوری پرچھائیں آتے ہیں۔

پھر مجھے دلیپ سنگھ کی آواز اس سارے راگ کے ساتھ بہتی اپنی طرف آتی سنا دی جو کہہ رہا تھا۔ "بھاؤ دلدار سنگھ، بھاؤ دلدار سنگھ سے" اس کی آواز میں کتنا دکھ تھا۔ کہ میں ہنس پڑا۔ میں نے وہ اتم تار اپنے اندر چھپا لیا۔ اور ڈرے ہوئے دلیپ سنگھ کو زور سے کہا "کیوں بھاؤ کیا بات ہے؟"

جب پتھریلے تاروں کو سیندوری سائے نگل چکے تھے اور پھاگن کی ہوائیں کھیتوں پر سے وداع ہو گئی تھیں۔ دادی نے مجھے گلے لگا لیا اور جنتی پیڑھی پہ یوں سہمی بیٹھی تھی گویا اسے مجھ سے ڈر آتا ہو۔ پھر دادی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور ماں دیٹے کی لو بڑھانے کے لئے بتی کو اونچا کرتی کرتی گر پڑی۔

مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ جنتی کو کیا ہوا ہے اور دلیپ سنگھ کیوں اداس ہے۔ دادی اور ماں کیوں اتنی پریشان ہیں کیا انہیں موسم کے وداع ہونے کا اتنا ہی افسوس ہے؟

پھر چنتی کا بچہ رونے لگا۔ اور میری آنکھوں میں اتنی دھند اتر آئی جیسے کچھ دکھائی ہی نہ دے۔ جیسے دیا بجھ گیا ہو۔ میں نے چیخ کر کہا "ماں دیا بجھ گیا ہے اس کو پھر جلاؤ۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں آتا کچھ نہیں....."

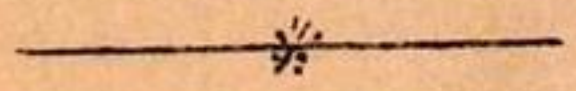

ڈونگے ہنیرے

دوسرے دن کے چڑھتے سورج نے سردار مہر سنگھ کو کھلے کیس بے سُدھ کاٹھی کے بغیر گھوڑی پہ بیٹھے اور وزن کھیڑے کی طرف جاتے اور چیختے ہوئے پایا۔ اس کی وہ سوانیاں جو پردہ میں رہتی تھیں۔ اور ننگے منہ کبھی باہر نہ نکلی تھیں۔ گلیوں میں بے پردہ روتی چیختی اور سر پہ خاک ڈالتی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں کل ڈوبتے سورج کے سیندوری پہ چھائیوں نے لالڑیاں کی ساری خوشیاں سمیٹ لی تھیں اور اب صرف گہرا اندھیرا تھا۔ جس میں کسی کو راستہ نہ ملتا تھا۔ اور ہر ایک اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ کھیتوں میں ہل چلاتے لوگ کام چھوڑ کر وزن کھیڑے کو بھاگے جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے آسمان گر پڑا ہے اور ہر ایک اپنے بچاؤ کی فکر میں بھاگا جاتا ہے۔

بلو چیختی ہوئی آئی اور آنگن میں سے آوازیں دینے لگی " نی چنتی، نی چنتی، دیپو نے گلے میں پھانسی ڈال کر اپنے آپ کو مار لیا "۔ اور پھر وہ کھڑی دھاڑھیں مار مار کر یوں رونے لگی جیسے اس کا دل تو بس ٹوٹ ہی گیا ہو۔

چنتی اپنے بچے کو چارپائی پہ پٹخ کر جلدی سے باہر نکل آئی اور ہاتھ ملتی ہوئی بولی " نی بلو تجھے کس نے بتایا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات جھوٹ ہے۔ ہائے نی میری دیپو میری سہیلی۔ نی میں تو اس کے بیاہ میں بھی نہ جا سکی۔ ہائے بلو یہ بات جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔ ہائے نی میری ماں۔ دیپو کو کیا ہو گیا "۔ وہ وہیں زمین پہ بیٹھ گئی اور بین کرنے لگی۔ دادی رات کو کتنی بیمار تھی لگتا تھا۔ سویرے بچے گی نہیں۔ مگر یہ سن کر اٹھ بیٹھی اور ماں سے کہنے لگی " کرتے اجیت کور کیا بات ہے، چنتی کیوں رو رہی ہے، دیپو کو کیا ہو گیا ہے "؟

ماں نے بہت ہولے سے کہا " دیپو گلے میں پھندا ڈال کر مر گئی ہے "!

دادی نے زور سے کہا " نی کرتے ٹھیک کہہ رہی ہے سچ "؟

اور ماں نے اسی دھیرج سے کہا " ہاں " ماں کو تو سوچ ہوا نہ بات عجیب لگی اور نہ ہی اس نے کسی حیرت کا اظہار کیا۔

دادی پلنگ پہ ادھ موئی سی گر گئی۔ جیسے گرنتھ صاحب کو گوردوارے میں ماتھا ٹیک رہی ہو۔ نہ جانے وہ منہ ہی منہ میں کیا کہہ رہی تھی۔

دیپو کے دیور ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے کہاریاں جو ابھی رات کی چیزیں بھی سمیٹ کر فارغ نہ ہوئی تھیں لال کپڑوں میں

دہائیاں دیتی پھرتی تھیں۔

میں نے کہا "یہ جھوٹ ہے کسی بیری نے آکر سب کو پہ یشان کر دیا ہے رات ہی تو دیپو سرخ پہ دوں والی رتھ میں بیٹھی پونڈوں کی بارش میں وزن کھڑے گئی ہے۔ وہاں اس کی ساس نے اُسے اور حاکم سنگھ کو دہلیز کے باہر کھڑا کر کے دونوں پہ سے پانی وار کر پیا ہو گا۔ اور پھر رات پڑے انہیں گورد وارے میں ماتھا ٹیکنے لے گئی ہو گی۔ وہ تو اپنے باپو کے قول کو پورا کرنے کی خاطر بہت تسلی سے وزن کھڑے میں رہنے اور وہاں نسلوں کو بدلے لینے، آن پہ مرنے کا سبق دینے گئی تھی، بھلا وہ کہیں مر سکتی ہے؟"

آخری رات جب اس نے اپنی ساس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی میرے قدموں میں پھینک دی تھی تو مجھے لگا تھا کہ وُہ دھرتی ہے، سارے دکھ سہنے والی اور چپ رہنے والی، بادلوں کی گھن گرج میں بھی اپنا سینہ کھول کر برکھا کو برداشت کرنے والی اُس رات اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو نہ سورج میں ہوتی ہے اور نہ چاند میں۔ بس کبھی کبھار یا تو پانی کے میٹھے ٹھنڈے دھارے سے نکلتی ہے اور یا گندم کی ہوا میں لہلہاتی بالیوں میں دکھائی دیتی ہے اس نے اپنے گھٹنوں کے نیچے تک لٹکتے بال کھول رکھے تھے جو سیاہ جال کی طرح اس کے گرد پھیلے تھے۔ پھر اس کالے جال کی ڈوری آپ سے آپ ہی اس کے گرد تنگ ہو گئی۔ اس نے مچھلی کی طرح وزن کھڑے کی ریت کے دریا کنارے دم توڑ دیا۔ مجھے

آج بھی پکا یقین ہے کہ اُس نے اپنے باپو کا نہیں بس اس کے قول کا پالن کیا تھا۔

سارا دن نہ کسی نے روٹی کھائی اور نہ پکائی۔ چنتی روتی ہر سنگھ کے گھر گئی۔ جہاں کھلے دروازوں کے آگے مہریاں کنجیاں کھڑکاتی پیڑھیوں پہ بیٹھی دیپو کی باتیں کر رہی تھیں اور گھڑی گھڑی حویلی کے باہر جا کر جھانک لیتی تھیں۔ چنتی کو دیکھ کر انہوں نے سر ڈھانپ لئے اور اونچی آواز سے رونے لگیں۔ سب سے بوڑھی کہاری کہنے لگی "چنتی بی بی تو اپنی سہیلی کے بیاہ میں بھی نہ آئی۔ ہائے اس کو کتنا روپ چڑھا تھا۔ بس مہارانی لگتی تھی۔ سُرخ جوڑے میں لال کی طرح دگ دگ کرتی چمک رہی تھی۔ جب نائن نے اس کی چوٹی گوندھی ہے تو کہنے لگی "ذرا زیادہ کس کے نہ کر ماسی میرا سر دکھنے لگے گا"۔ ابھی تو خوشی کے پاؤں میں راہ کی دھول بھی نہ لگی تھی کہ صبح ہی صبح یہ خبر آ گئی۔ رات جو نائن اس کے ساتھ گئی تھی۔ سویرے سویرے روتی چیختی آ گئی کہ "بی بی دیپو گلے میں دوپٹہ ڈال کر مر گئی ہے"۔ اس سے زیادہ ہمیں کوئی خبر نہیں جو وزن کھیڑے جاتا ہے وہیں کا ہو رہتا ہے"۔

پھر جب دن ڈھلنے لگا اور راہ کی دھول ساری خوشیوں پہ تہہ در تہہ جمع ہو گئی تو وزن کھیڑے کے رتھ میں دیپو کی ڈولی لوٹ آئی۔ دادی نے ہر سنگھ کی بیوی کی طرح سفید چادر اوڑھی اور چپ چاپ جا کر سیاپا کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ اس نے سب سے بڑھ

چڑھ کر سیا پا کیا - پیٹ پیٹ کر اپنی چھاتی لہولہان کر لی اور دیپو کی ماں ہرسنگھ کی بیوی سردارنی، دیپو کے پاس اس طرح بیٹھی تھی جیسے مر جائے گی - وہ دادی کی طرح ہر ایک کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی - جب میرا باپو اتم سنگھ آنگن میں چادر سے منہ ڈھانپے لیٹا تھا اور دس گاؤں کے لوگ گلیوں میں روتے پھرتے تھے۔

تیسرے دن پولیس حاکم سنگھ کو وزن کھیڑے سے پکڑ کر لے گئی - اس نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا کہ دیپو کے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اور مروڑ کر اسی نے مارا ہے - اس لیے کہ دیپو نے اسے بتایا تھا کہ میں نے تو بس باپو کے قول کا پالن کرنے کے لئے اس سے بیاہ کیا ہے ورنہ میں تمہارے ولایت پاس ہونے پہ تھوکتی بھی نہیں" - ہائے دیپو نے ذرا بھی شرم نہ کی - ذرا جھجک نہیں کی - وہ ہیروں کے زیور پہنے بیٹھی تھی اور اس نے ایک ایک زیور اتار کر رکھ دیا تھا اور پھر کہا تھا "میں نے کوئی برا کام نہیں کیا پہ میرے جی کو کوئی اور اچھا لگتا ہے - تم مجھے یونہی رہنے دو - میں تمہاری نہیں ہوں"

اور حاکم سنگھ نے رنج غصے اور بے عزتی کے ملے جلے جذبات کے تحت دوپٹہ ڈال کر اسے مارنا چاہا تو دیپو نے کہا "نہیں میں نہیں چاہتی کہ تم یوں جوان موت مرو - میری گردن کا منکا توڑ دو پھر دوپٹہ ڈال کر مروڑ دینا یوں لگے گا جیسے میں نے آپ ہی پھندا گلے میں ڈال کر اپنی جان لی ہے" حاکم سنگھ نے بتایا -

"پھر وہ سکون سے گردن نیچے کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے زور سے جھٹکا دے کر اس کی گردن کا منکا توڑ دیا اور اس کی سرخ ستاروں بھری چنری جس میں وہ سوئی ہوئی لگتی تھی۔ اس کے گلے میں ڈال کر نیچے اتر آیا۔ اور یوں وہ سہاگ رات ختم ہو گئی"۔

دادی یہ ساری باتیں سن کر آئی تو اس کے قدم زمین پہ نہ پڑتے تھے مجھے کہنے لگی "دلدار سنگھ پوت بس میرا جو کام تھا وہ ختم ہو چکا۔ ہر سنگھ سے بدلہ لے لیا گیا۔ میری جان پہ سے بوجھ اتر گیا ہے۔ واہگرو۔ تیری بڑی عمر کرے"۔

اور جس دن دیپو کو مرے ساتواں دن تھا۔ چپ چاپ دادی یوں مر گئی جیسے ہوا کا ایک جھونکا نصلوں میں کہیں سے آ نکلے اور آن دیکھے ہی نکل جائے۔

دھیان پور والے، مہاراج پور والے لالڑاں والے سب دادی کی ہمت بہادری نیکی کی تعریف کر رہے تھے مرنے کے بعد رہ جانے والوں کو یا تو نیکی یاد رہ جاتی ہے اور یا برائی۔ ماں اُتے کی موت پہ ایسا چیخ چیخ کر نہ روئی تھی، جیسا سیا پا اس نے ساس کے مرنے پہ کیا۔ سردار نی کرتار کور جس نے شیرنی کی طرح بے ڈر ہو کر ساری زندگی گزاری تھی محنت کی تھی اور کسی کا احسان نہ اٹھایا تھا۔ چپ چاپ اس جہاں سے گزر چکی تھی۔

جب میں لالڑاں میں دادی کے کہے کے مطابق گردن اٹھا کر چل

سکتا تھا۔ نہ دادی زندہ رہی کہ مجھے دیکھ سکے اور نہ ہی دیپو تھی جو اپنی سیاہ پلکوں کی جھالر اٹھا کر مہارانی کی طرح اپنے جھروکے سے باہر جھانکے اور کہے "یہ چاکر اچھا ہے، کتنا جوان ہے کیسا نکلتا قد ہے کیسی چمکتی آنکھیں ہیں۔ ہنستا یوں ہے جیسے کوئی جھرنا کل کل کرے، اور کتنا اونچا ہے کہ کبھی مجھے ایک انگلی سے بھی نہیں چھوتا۔"

لالڑ اں میں لوگ یہ باتیں سنتے اور ہولے ہولے گلیوں میں جاتی عورتیں باتیں کرتیں "شہر سے پڑھ کر آئی تھی نا اسی لیے ایسی تھی۔"

"بھئی واہگرو کی قسم ہمیں تو کبھی نہیں لگا کہ اتنی خراب ہو گی۔"

اور تیسری کہتی "یہ تو بڑی عجیب بات ہے اگر کسی کے ساتھ تعلقات تھے تو آخر بڑھاپے میں باپو کی سفید داڑھی میں خاک ڈالنی کیا ضرور تھی نہ بتاتی حاکم سنگھ کو۔"

اور پھر نہ جانے اور کیا کیا باتوں کا چکر سا چلتا۔ اس کی چال سے لے کر اس کے بولنے اور بات کرنے کے طریقے پہ ہزار ہزار باتیں ہوتیں اور ساری پھٹکاریں جو عورتوں نے کسی موقعہ کے لئے سنبھال کر رکھی تھیں اس پہ پڑتیں۔ آج بھی سوچتا ہوں تو سمجھ نہیں آتی کہ دیپو کے اور میرے درمیان کیا رشتہ تھا؟ وہ میرے لئے گرنتھ کی طرح متبرک تھی۔ وہ میرا ایمان تھی — اگر کوئی ان دنوں مجھے پوچھتا تو میں اسی کی سوگندھ اٹھا کر کہتا کہ میں نے کبھی اس کے زیادہ قریب ہونے اور اسے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ لینا اور دنیا کی نظروں

سے دُور کہانیوں کے راجکماروں کی طرح دیپو سے ملنا میری خوشی تھی۔ دادی نے بھی اپنے طور پر یہی سوچا تھا کہ میں نے مہر سنگھ سے بدلہ لیا ہے۔ ماں بھی سوچتی رہی۔ صرف جنتی کو مجھ پر اتنا وشواس تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو۔ چاہے باپو نے عورت کا بدلہ عورت ہی کہا ہو۔ پر دلدار سنگھ دیپو کے لئے کوئی بری بات اپنے جی میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ سب کہانیاں جو میرے بن کہے ہی اِدھر اُدھر سے سن کر اور جھوٹ کو چھان کر اُس نے آپ سے آپ بنائیں ان میں کبھی یہ خیال نہ ہوگا کہ میں اور دیپو کوئی ایسا کام بھی کر سکتے ہیں جو دنیا میں بُرا سمجھا جائے۔

پھر ایک شام جب ماں ٹھنڈے کھوہ سے پانی بھرنے گئی تھی اور چولہے میں دیا دھیما دھیما جل رہا تھا اور جنتی کا بچہ سویا ہوا تھا تو اس نے پوچھا "دیر دلدار سنگھ دیپو نے ایسی غلط بات تمہیں کہی تھی حاکم سنگھ سے؟"

میں چپ رہا۔ تو اس نے کہا "دلدار دیر میرا جی بہت دکھتا ہے ایسی باتیں سن کر۔ دیپو میری سہیلی تھی۔ باپو کی بات تو اسی طرح رہی۔ پر یہ بوجھ تو نہیں ہے نا ہمارے کندھوں پر؟"

تب بہت دنوں بعد میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کر دلیری سے بات کی اور جنتی کو کہا "تو یہ بات ـــ سوچ سکتی ہے۔ وہ میرے لئے اتنی ہی پوتر تھی جتنی تُو ہے مجھے تیری قسم"

اور جنتی جیسے سُکھ کا سانس لے کر بولی "بدلہ لینے کو تو ایک عمر

پڑی ہے۔ کونسی جلدی ہے ہمیں"

جب بڑے شہر میں مقدمہ چل پڑا اور حاکم سنگھ ضمانت پہ چھوٹ کر وزن کھیڑے آگیا تو سردارنی دیپو کی ماں نے بہت پاٹھ کروائے اور روز روز گوردوارے میں جانے لگی وہ اپنے آنگن میں ننگی زمین پہ سوتی اور اس نے گرنتھ صاحب پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ جب تک حاکم سنگھ کے گلے میں بھی دیپو کی طرح رسّہ نہیں پڑے گا۔ اور جب تک اس کی بھی بنا منکے کے گردن اِدھر اُدھر نہیں جھولے گی وہ سردیاں گرمیاں، مینہ اور آندھی میں اسی آنگن میں ننگی زمین پہ سویا کرے گی۔ ہرسنگھ نے بہت کہا "بھاگوان! پتہ نہیں کن کرموں کا پھل ہے دیپو کی سی جوان بیٹی یوں مر گئی جیسے چیونٹی پیر تلے آکر کچلی جائے۔ تو کیوں ایسی قسمیں کھاتی ہے ہماری لڑکی تو اب واپس نہیں آنے والی تو چاہے ساری عمر بھی زمین پہ سوئے اور گرنتھ صاحب کے اوپر ہاتھ رکھ کر تول کرے"۔

اور سردارنی نے جوگن کے سے کیس بکھیر کر، رو رو کر اپنا سر دیواروں سے مار مار کر کہا تھا "ہائے تجھے کیا پتہ ہے کلیجے کو آگ کس طرح لگتی ہے۔ میری کھیتی کھاتی دیپو مجھے کس طرح بھول سکتی ہے تو تو بھولی باتیں کرتا ہے یہ دولت کس کام کی ہے اب"۔

سردار ہرسنگھ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ اور اٹھ کر بیٹھک میں چلا گیا تھا۔

چنتی نے وزن کھیڑے میں ایک لڑکی دیکھ لی تھی اور میری بات

دہاں پکی کرنے کی صلاح لینے وہ جب واپس للارطاں آئی ہے تو دادی کو مرے ایک سال ہو چکا تھا۔

میں نے کہا "چنتی تو کیوں ایسی بات کے پیچھے پڑی ہے جس میں نہ میرا من لگے گا۔ اور نہ چت، دوسرے گاؤں کی بات ہے اور پھر پرائی لڑکی کو لا کر سکھی نہ رکھنا مردوں کا کام نہیں۔"

ماں نے جب سنا کہ میں انکار کر رہا ہوں تو وہ رو پڑی۔

"چنتی بیٹی اگر سکھ میری قسمت میں ہوتا تو سر کا سایہ کیوں مرتا۔ سر ننگا ہوا تو میں نے اس امید میں۔ سال گزار دیے کہ پوت جوان ہوگا بہو گھر آئے گی۔ چولہا چوکا سنبھال لے گی تو میری بوڑھی ہڈیوں کو بھی چار دن آرام مل جائے گا۔ اب چار گھڑی رات گئے سو کر ایسے سانجھ سویرے اٹھنا پڑتا ہے۔ بھلا میں اب ایسے کام کر سکتی ہوں۔ اس کا تو جی ہے کہ میں روتی بین کرتی یونہی مر جاؤں۔ اکیلی سارا دن من ہی من میں جانے کیا کیا سوچتی ہوں اور یہ کہتا ہے اس کا من نہیں لگتا۔ بھلا اس سے پوچھ تو سہی کس سوانی کی راہ دیکھ رہا ہے جو آکاش سے اترے گی۔ کوئی مہارانی ہوگی کہ کوئی پری۔"

اور میں نے چنتی سے کہہ دیا۔ جو تیرا جی چاہے اس طرح کر میں ماں کا دکھ نہیں دیکھ سکتا۔

ماں نے جانے کب کب کے کپڑے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے کہ گھر میں گانے والیوں کو بٹھا کر ڈھولک بجواتی اور کپڑوں میں گوٹے

اور ستارے لگاتی رہتی ان دنوں ہمارا آنگن بدھائی دینے والیوں سے بھرا رہتا۔ اپنے اپنے سسرال سے چنتی کی سہیلیاں پندرہ دن پہلے ہی آ گئیں۔ گھر میں ہر وقت جھانجھروں والے پاؤں کے گیت گونجتے رہتے۔ روتے بچوں اور دوسرے شور و غل کے درمیان بڑے بڑے توؤں پر نائنیں روٹیاں پکاتیں۔ خوشبو والی باسمتی کے چاولوں پر گھی کی باس ہوتی۔ میں باہر حویلی میں پڑا رہتا یا چوپال میں دوستوں یاروں کے ساتھ مل کر شراب پیتا اور دل کا دکھ بھلانے کے لئے کھیتوں کے کنارے گھومتا رہتا۔ یا درختوں کے تنوں پر ہاتھ رکھے چپ چاپ آکاش کو تکتا رہتا۔ زندگی کتنی کٹھور ہے اور انسان کتنا بے بس!

میری بیوی سروپ کور اُس رات وزن کھیڑے والے سردار مل کے ہاں آئی ہوئی تھی جس دن دیپو بیاہ کر وہاں گئی ہے اور صبح جب نائن روتی پیٹتی نیچے اتری ہے اور دہائی دیتی ہوئی سیڑھیوں میں گرنے سے بچی ہے تو سروپ کو پہلے سے پتہ تھا کہ دیپو مر چکی ہے۔

اور میں نے بہت حیران ہو کر پوچھا "کیوں تم کو کیسے معلوم تھا؟"

"اس طرح کہ رات کے پہلے پہر ہی حاکم سنگھ نے چوبارے میں سے اتر کر اپنے بابو کو بتا دیا تھا کہ اُس کی بہو نے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی جان لے لی ہے۔ مگر گاؤں کے خوف اور بدنامی کے ڈر کی وجہ سے کسی نے شور نہیں مچایا تھا۔ سارے دم سادھے سورج نکلنے کا انتظار

کرتے رہے تھے۔ تاکہ نائن خود ہی دیپو کو دیکھ لے۔ دیپو کی طرح میں نے پہلے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور نہ بعد میں دیکھوں گی۔ اس کے سر کے بالوں میں پروئے سونے کے پھول ہیروں سے جڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کی چمک کے ساتھ ساتھ زیادہ روشن لگتے تھے۔ وہ بہو تھی پر سب کے چہروں کو ایسے لگتی تھی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ کاجل کی وجہ سے پلکیں ریشمی جھالر لگتی تھیں اور وہ اس جھالر کے نیچے سے ہر ایک کو پرکھ رہی تھی ساری رسمیں ہو چکیں تو اس نے کلائیوں تک بھرے سرخ چوڑے میں سے کلیرے نکال کر رکھ دیئے۔ نائن نے کہا "بی بی ابھی نہیں! ابھی نہیں" تو اس نے ذرا سا مسکرا کر کہا تھا "یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے میری باہیں دکھنے لگی ہیں" پھر انہوں نے اسے سرخ رنگ کے کسی قیمتی ریشم کا گھگھرا اور ستاروں بھری چولی پہنائی۔ اور کتنی ہی خوشبوؤں کی دھونی اس کے کمرے میں اور اس کے گرد پھیلائی یہاں تک کہ ہر شے مہک گئی پھر آنکھیں بند کرنے کو کہا گیا جب آنکھیں بند کر کے دیپو بیٹھی تھی تو تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ اور گھگھرے کی گوٹ کے اندر کھسکا کر رکھے ہوئے خوشبوؤں کے کٹورے میں سے خوشبو اس کی انگلیوں کے ناخنوں تک میں رچ گئی تھی۔ پھر دیپو کا شنگار کیا گیا۔ اس کی سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح جھول رہی تھی۔ اور اس میں سرخ ریشم کا لچھا پڑا تھا۔ مہندی سے سرخ ہاتھوں میں ایسی لالی تھی جس سے نہ جانے کیوں ڈر آتا تھا۔ بادلے کے جھم جھم ستاروں بھرے دوپٹے کو اوڑھ کر جب اس نے اپنی شکل دیکھی تو حیران رہ

گئی ہوگی۔ کیونکہ پاس کھڑی نائن سے اس نے پوچھا تھا "ماسی میرا شنگار کیسا اترا ہے"

"اور نائن نے جھٹ پٹ اُسے چوم لیا تھا۔ اُسے دعائیں دینے لگی تو وہ سُسرال والیوں کا لحاظ کیئے بنا زور سے ہنس پڑی۔ اور اس کی کمر بل کھا گئی۔ بالکل کومل نرم نئی ٹہنی کی طرح۔

"ہم سب نے سوچا پڑھی لکھی ہے نا اس لیئے ہنستی ہے۔ جب ہم اُسے اوپر چوبارے میں چھوڑ کر نیچے آ رہے تھے تو اس کے چہرے پہ کتنا سکون تھا۔ ایسی نرمی اور ایسی سندرتا جو بس مہارانیوں میں ہی ہو سکتی ہے اس زمین پر رہنے والی کسی لڑکی میں نہیں۔ اور میں نے واپس جا کر سیڑھیوں پہ سے لوٹ کر اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کے کنوارے بھولے اور بے پناہ حُسن کو دیکھا۔ نہ جانے کس نے میرے دل میں چپکے سے کہا "دیکھ لے، دیکھ لے جی بھر کر دیکھ لے تو پھر اس شکل کو دیکھ نہ سکے گا" اور جب میں نے کتنی دیر گھونگھٹ اٹھائے رکھا تو اس نے کہا "آبی بی بیٹھ جا۔ دو گھڑی بات کر"۔ کمرے میں دھواں نہیں تھا۔ خوشبو کی نیلاہٹ تھی۔ جیسے موم بتیوں کے اوپر شام کی دھند پھیلی ہو۔ اور اس نیلے دھوئیں کے اندر موم بتیوں کی روشنی سے زیادہ چمکیلی دیپ مجھے یوں لگی تھی جیسے وہ کمرے میں نہیں آکاش پہ بیٹھی ہو پھر مجھے شرم آگئی اور میری ساتھ والیاں آوازیں دینے لگیں تو میں تیزی سے بھاگ آئی۔

"حاکم سنگھ بہت خوش تھا۔ ہم سب اس کے گرد ہو گئیں اور

اُسے بتانے لگیں کہ اس کی بیوی کتنی خوبصورت ہے۔ جب ہم نے کہا کہ وہ ولایت کی میموں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے تو ہنس کر بولا" تو تم لوگوں کا خیال ہے وہاں کی عورتیں اپنے دیس کی عورتوں سے اچھی ہوتی ہیں بھئی وہ تو تمہاری جوتی کی برابری نہیں کر سکتیں"

"ہم سب زور زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ڈھولک بہت تیزی سے بجنے لگی۔ اتنے زور سے کہ ہماری ہنسی کی آواز دب کر رہ گئی۔ ویسے ہمیں یہ بھی خوشی تھی کہ ولایت سے آئے ہوئے حاکم سنگھ سے جو ہماری برادری کا سب سے اونچا اور اچھا سُندر جوان ہے ہم باتیں کر رہی تھیں۔

"حاکم سنگھ چلا گیا تو ہم سب گھڑی دو گھڑی ناچیں۔ تماشا کرتی رہیں اور پھر رات نے ہماری آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا۔

"کوئی دو پہر رات بیتی ہو گی۔ جو میں پانی پینے اٹھی۔ ایک ایک کوٹھڑی میں بیس بیس لوگ گھُسے سو رہے تھے سردی تو کیا لگنی تھی۔ بیٹھک میں ذرا سی روشنی ہو رہی تھی اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ننگے پاؤں ہی دروازے کی طرف گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے معلوم تھا۔ دیپو کو کچھ ہو گیا ہو گا۔ میری ٹانگوں میں سے جان نکل گئی۔ حاکم سنگھ گھبرایا ہوا ننگے سر کھڑا تھا۔ اس کی ماں ہاتھ مل رہی تھی اور باپ زمین پہ بیٹھا کہہ رہا تھا" یہ کیا ہو گیا۔ میرے گھر میں یہ کیا ہو گیا۔ ارے اتنی سندر بہو کو کس کی نظر کھا گئی کیا آئی اس کے جی میں۔

ارے نہیں جاکر تو دیکھ یونہی بے ہوش ہو گئی ہو گی۔" مگر حاکم سنگھ نے کہا" میں کس جگہ سے آیا ہوں جو غلط کہوں گا۔"

"اور باپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا" سچ سچ کہہ تو نے تو نہیں اُسے مار ڈالا۔ کہیں تو نے آج شراب تو زیادہ نہیں پی لی تھی۔ حاکم سنگھ تو ہوش میں تو ہے۔"

"اور حاکم سنگھ نے بہت دھیرج سے کہا" میں جھوٹ نہیں کہہ رہا جو ہونا تھا سو ہو چکا!"

"پھر ماں بڑے دکھ سے رونے لگی اور آواز کو دبانے کے لیے ہونٹوں کو اندر سے کاٹنے لگی۔ باپ بیقرار زخمی جانور کی طرح بیٹھک میں پھرنے لگا۔ جیسے خود اس کی جان نکلنے والی ہو۔

"حاکم سنگھ نے کہا میں ذرا کھیتوں کی طرف جاتا ہوں اپنے آپ کو سنبھالو۔ سویرے تو خود بخود پتہ لگ جائے گا۔ اس وقت سارا جگ سو رہا ہے۔ رونے اور واویلا کرنے سے فائدہ" اور وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نکل گیا۔ وہ صرف ایک ریشمی قمیص پہنے تھا۔

"اور پھر سویرے ورن کھیڑے میں اتنا شور ہوا ہے کہ کسی گرو کے شہید ہو جانے پر بھی نہیں ہو سکتا۔

"نائن نے آتے ہی سب سے پہلے کہا کہ دیپو کو مار گیا ہے وہ خود نہیں مری۔ مہندی والے ہاتھوں سے ڈھولک پھینک کر پاؤں میں چھانجھر دل کی پروا کیے بنا عورتیں ادھر اُدھر بھاگتی اور بین کرتی پھرتی تھیں۔"

میں نے پوچھا "پر سروپ تمہیں تو پتہ تھا تم نے بھی نہیں بتایا تھا کسی کو؟"

"میں پانی پیئے بنا اپنی ٹانگیں گھسیٹتی کسی نہ کسی طرح کوٹھڑی میں پہنچی اور لیٹ گئی میرا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دیپو کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اور مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی کہ وہ کیوں سب کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی اور جب اس کا شنگار کیا گیا تھا تو چپ چاپ اپنی صورت شیشے میں دیکھ کر ہولے ہولے ہنستی رہی تھی"۔

میرا جی چاہتا تھا میں حاکم سنگھ سے ملوں، پر جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے یہ نہیں کہ میں موت سے ڈرتا تھا۔ پر ایسی بات کہنے کا فائدہ؟ مجھے سمجھ نہیں آتا جو ویر بہنوں کو مار دیتے ہیں۔ بیویوں کے گلے پہ چھری چلا دیتے ہیں ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ عدالتوں میں کیوں اپنی مٹی خود اڑاتے ہیں اور جان بچانے کی خاطر اس عزت کو دنیا کے سامنے نیلام کرتے ہیں انہیں بھلا اس سے کیا فائدہ ہوتا ہو گا۔ وہ عزت جس کو بچانے کی خاطر وہ ایک ہنستی کھیلتی پھول کی طرح کی بہن یا بیوی کو اپنی راہ سے ہٹا دیتے ہیں پھر راستوں کی خاک میں مل جاتی ہے اور گاؤں گاؤں اس کا چرچا ہوتا ہے۔

دیپو میرے لئے پوتر رات کی سیا ہی بن گئی جو آکاش کے قریب اور تاروں سے ذرا نیچے کہیں ڈولتی ہے اور جسے کوئی چھو نہیں سکتا۔ مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ دیپو نے ایسا کیوں کیا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو میں

اس سے پوچھتا۔ مگر پھر ایسی بات کہنے سننے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ باپو کا قول نبھائے گی۔ اور وہ وچن کھیڑے چلی گئی پھر ایک رات میں نے اپنے باپو کو سپنے میں دیکھا۔ کہنے لگا۔

"دل دار سنگھ ماں یہ کہتی ہے کہ تو نے اپنا بچن پورا کیا ہے اور میں کہتا ہوں نہیں کیا۔ میں بھوت بن کر پیچھا کروں گا۔ اگر تو اپنا کہا پورا نہیں کرے گا تو مہر سنگھ کو مار کیوں نہیں دیتا"

اور سپنے میں ہی میں نے کہا تھا "باپو مہر سنگھ تو پہلے ہی مرا ہوا ہے میں اُسے اور کیا ماروں۔ اگر تو آئے تو دیکھے کہ اس کی کالی داڑھی ایک دم سفید ہو گئی ہے وہ گھوڑی پہ اکڑ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہی گاؤں کی گلیوں میں اُسے دوڑاتا ہے آنکھیں نیچی کر کے چلتا ہے اور گوردوارے میں اپنی سوانی کے ساتھ ہر روز جاتا ہے۔ اب وہ اور کیا مرے گا۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہے وہ تو تُو مر کر اب سکھ چین سے ہے پر اُسے روز مرنا ہے بتا کیا وہ بھوت نہیں لگتا"

اور باپو نے زور زور سے ہنس کر کہا "پر تیرا قول، میں پوچھتا ہوں تیرا قول؟"

میں نے کہا "اُتمے سن، وہاں کہیں دیر بھی ہو گی اُس سے پوچھ لینا کبھی کبھار بدلہ لینا دشمن کو معاف کرنے سے بھی ہوتا ہے میں نے مہر سنگھ کو معاف کر دیا تھا۔ آگے تیری مرضی ہے اگر تو بھوت بن کر میرے پیچھے آنا چاہے تو آجا" اور اُتم سنگھ نے کہا "جب تک مہر سنگھ زندہ

ہے میں کس طرح چین سے رہ سکتا ہوں"۔

اگلے دن سویرے حاکم سنگھ کے مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا جب رات کو آنگن میں درخت کے نیچے سوئی ہوئی سردارنی کو کسی شے نے کاٹ لیا۔ وہ ہائے ہائے کرتی رہی اور سردی کی اس ٹھنڈی رات میں کالا ناگ اُس کے پاس ہی کنڈلی مارے کھڑا تھا۔ جوگندر سنگھ ماں کے سرہانے اور سردار مہر سنگھ اکڑی ہوئی سردارنی کی طرف ایک نظر دیکھ کر گھوڑی پر سوار ہو گیا اُس نے کسی کہار کو اپنے ساتھ نہیں لیا اور نہ ہی برادری کے کسی آدمی کو۔ سارے لوگ اس سے پہلے ہی شہر پہنچ چکے تھے اس کا سر جھکا ہوا تھا اور باگیں ڈھیلی تھیں۔ گھوڑی بھی ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھی اور پھر مڑ کر سردار کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ پہلے ان راہوں پر اُسے سرپٹ دوڑایا جاتا تھا۔ اور راہ اس کے قدموں کے نیچے دھول بن جاتی تھی۔ مہر سنگھ رو رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی پہ آنسو بہہ رہے تھے۔ جن کو وہ پونچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اور گھوڑی بڑی بے چین ہوتی اپنے مالک کی ایک ایک رمز پہچاننے والی ایک ایک اشارے کو جاننے والی ٹھہر ٹھہر جاتی تھی اور ہنہناتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو" کیوں مالک کیا بات ہے کیوں سردار کیا بات ہے؟"

سردار نے گھوڑی ایک بڑ کے اونچے درخت کے نیچے ٹھہرا لی۔ یہ بڑ بہت پرانا تھا اور نہر کے کنارے سے لے کر ہمارے کھوہ تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں وہ گھوڑی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ درخت کے

نیچے ایک چبوترہ تھا۔ جہاں ہندوؤں کا ایک بت تھا۔ پھر وہ مورتی ٹوٹ گئی چبوترہ ویران ہو گیا جس پر کبھی کبھار دوسری طرف سے آنے والے انجان راہی ٹھنڈے سائے میں دو گھڑی آرام کرنے کو بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ گاؤں والوں میں سے کوئی کبھی یہاں قدم نہ دھرتا۔ سنا تھا جو کوئی اس پر قدم دھرتا ہے اس کا سارا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ بال بچے ڈھور ڈنگر مر جاتے ہیں۔ فصل سوکھ جاتی ہے اور خاندان کا نام تک باقی نہیں رہتا۔

سردار کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور گھوڑی اس کے پاس کھڑی تھی کبھی ہنہناتی اور کبھی آگے منہ کر کے سردار کے سر کو سونگھتی اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نہ جانے اُسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی جب میں گاؤں کی سیدھی راہ سے نہیں بلکہ اپنے کھوہ کی طرف ہو کر نکلا ہوں۔ سردار کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا اگر سرپٹ گھوڑی کو دوڑاؤں تو ایک گھنٹے میں بڑے شہر پہنچ جاؤں گا اور عدالت میں مقدمے کا فیصلہ سن لوں گا۔

قریب جا کر میں نے گھوڑی کو ٹھہرا لیا۔

اور وہ نگاہیں میرے دل میں گڑ گئیں۔ سردار نے ہولے ہولے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ میں چلا جاؤں۔

میں گھوڑی سے اتر پڑا اور قریب ہی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سردار

نے کہا۔" دلدار سنگھ اوپر نہ بیٹھ۔ تو ابھی جوان ہے تجھے زندہ رہنا ہے میں نے دونوں ہاتھوں سے عیش لوٹا ہے اتنا کہ اس سنگھاسن نے مجھے اُوب دیا ہے تو مجھ اکیلے کو اس پہ بیٹھنے دے۔" اور اس نے ہاتھ سے مجھے پکڑ کر چبوترے سے یوں ہٹا دیا جیسے میں ایک بچہ ہوں جنتی کے کاکے جیسا۔

جب میں اپنی گھوڑی ایک درخت کی شاخ سے باندھ کر پھر وہاں آ بیٹھا تو سردار نے کہا "تو اپنے راستے پر جا تیرا کیا کام ہے یہاں؟ عدالت کھل گئی ہو گی اور یہاں سے اگر گھوڑی کو سرپٹ دوڑائے تو تب کہیں تو اُس وقت پہنچے گا۔"

"اور تم نہیں چلو گے کیا؟"

"نہیں"

"پھر کیوں؟ آج مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے"

"میرا دل نہیں چاہتا۔ میری دیپو واپس تو نہیں آسکتی نا۔ اگر میں حاکم سنگھ کے خلاف بھی فیصلہ سن لوں تو مجھے کیا فائدہ ہو گا بھلا"

"زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے کے آگے دوڑنے سے یا پیچھے رہ جانے سے فائدہ تو کوئی نہیں ہوتا سردار بس تھوڑی دیر کے لئے ایک خوشی ہوتی ہے۔"

"میری خوشیاں ختم ہو گئی ہیں دلدار سنگھ۔ آج سویرے جب سردارنی کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی اور میں دیپو کے مقدمے کا فیصلہ سننے باہر نکلا تھا تو مجھے پتہ تھا کہ دل کے اندر کوئی شے مر گئی ہے

جو زندہ نہیں ہو سکتی۔ تم جوان ہو اور خوشیاں جوانی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ مقدمے جیتنے ہارنے کی خوشی بھی تمہاری عمر کا ایک حصّہ ہے ہم نے پوری زندگی اسی طرح ہارنے اور اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا کر اس بازی کو جیتنے میں بتائی ہے اب آخر میں اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"فرق!" میں نے حیرت سے کہا۔" وزن کھیڑے کے سرداروں کے اُڑے ہوئے چہرے زرد رنگ اور حاکم سنگھ کی خشک ہونٹوں پہ پھرتی زبان، اس کی بے آس آنکھیں اور ایسی نظریں جیسے وہ دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔"

"میں نے دوسروں کو سدا ایسا ہی دیکھا ہے دلدار سنگھ اب میری باری ہے۔ کیا تجھے پتہ نہیں کہ میں نے تیرے باپو اُتم سنگھ کو پھانسی پہ چڑھانے کے لئے کتنی دولت لگا کر خوشی حاصل کی تھی ہوئے یہ خوشیاں میرے خون میں زہر بن کر رچ گئیں اور میرا پانسہ پلٹتا گیا۔ تیری دادی سردارنی کرتار کور جب رات دن کھیتوں میں محنت کرتی اور ہل چلاتی تھی تو میں خوشی سے سینہ پھلا کر اپنی جیت کو محسوس کرتا تھا۔ جب تو پوہ کی لمبی راتوں میں سردی میں کانپتا کھیتوں کو پانی دیا کرتا تھا تو مجھے کتنی تسلی ہوتی تھی اب میں یہاں بیٹھا ہوں اگر تو چاہے تو اپنی دادی کی محنتوں کا اپنے باپ کی موت کا بدلہ مجھ سے لے لے، میں تیرا دین دار ہوں دلدار سنگھ۔ کیا تو مجھے اس گھڑی مار نہیں سکتا؟"

پھر اس نے ایسے دیکھا جیسے مجھ سے التجا کر رہا ہو۔ میرا ہاتھ اپنی

کرپان پر پڑی میری نگاہوں میں بابو کی صورت گھوم گئی۔ مجھے اپنی دادی کا جھریوں پڑا چہرہ یاد آگیا۔ تاروں کی چھاؤں سے لے کر شام تک اس کا کھیتوں میں محنت کرنا یاد آگیا۔ پھر میں نے کہا "ابھی وقت نہیں آیا"۔

سردار نے سر جھکا لیا تھا اور آنسوؤں کے قطرے موتیوں کی طرح اس کی داڑھی سے گر رہے تھے۔ وہ دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے ہاتھوں کو آپس میں جوڑے بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ اور اس کا تہمد میلا تھا۔ پگڑی کے پیچ ڈھیلے تھے۔

میں نے کہا "سردار تیرے میرے حساب کتاب کا وقت ابھی نہیں آیا پر یہ کہاں کی مردانگی ہے کہ ذرا سے دکھ سے پریشان ہو جاؤ۔ کیا دیپو کے مرنے اور سردارنی کی موت سے ایسے گھبرا گئے ہو۔ تمہیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کیا تم سردارنی کرتار کور سے بھی کم حوصلہ ہو جس نے انوپ سنگھ میرے دادے کی موت کے بعد اتم سنگھ اپنے جوان بیٹے کا غم بھی سہا اور پھر بھی محنت کرتی رہی"؟

"دلدار سنگھ! اس کے سامنے مجھ سے اپنا بدلہ لینے کا ارادہ تھا۔ وہ تم کو جوان کر رہی تھی وہ اپنا نام نہیں مٹانا چاہتی تھی۔ میرے بیٹے اپنی الگ راہوں پر ہیں جو نہ کسی راستے میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی بدلوں میں۔ میں اُن کے لیے ایک گزری بات ہوں، بیتی کہانی ہوں۔ بس چوپال کو سجانے کے لیے"۔

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ تم اُس راہ میں یقین کرنے لگو"۔ میں

تے ہو رہے سے کہا۔ "جس ڈگر پہ سدا چلتے آئے ہو اس پہ چل کر تمہیں نہ ڈمکتی ملے گی اور نہ شانتی - بس اپنے قول کو نبھانا اپنے وچن کا پالن کرنا ہی زندگی میں ایک کام ہے۔"

سردار نے دونوں ہاتھ زمین پہ ٹکا کر اپنے آپ کو سہارا دیا اور جھٹکے سے کھڑا ہو کر اپنی گھوڑی کی لگام پکڑ کر بولا -

"ہاں دلدار سنگھ! زندگی کے آخر میں چاہے شانتی اور مکتی نہ بھی ملے پہ ڈگر سے کہاں جاؤں - آؤ چلو۔"

ہم دونوں عدالت میں پہنچے ہیں تو آخری بیان ہو رہے تھے حاکم سنگھ کے وکیل نے عدالت میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ حاکم سنگھ شراب کی وجہ سے اندھا ہو رہا تھا اسے کسی بات کی ہوش نہ تھی - اس لئے اس پہ دیدہ دانستہ کلدیپ کور کو قتل کرنے کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا اور اس بات کا ثبوت اس کا تین دن بعد خود اقبال جرم کر لینا ہے۔ چونکہ فاضل جج کو ولایت جانے کی جلدی تھی اس لئے مقدمے کا فیصلہ اسی وقت سنا دیا گیا -

حاکم سنگھ کو عدالت نے باعزت بری کر دیا تھا - دیپو کی گردن میں جو ہیرا تھا اس کی قیمت ایک مٹی کے ٹوٹے پیالے کے برابر بھی نہ پڑی - میری آنکھوں میں خون اتر آیا - پھر سنگھ کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں - اور اس کے ماتھے پہ ایک رگ بار بار جیسے کانپ اٹھتی تھی ، بھڑک رہی تھی -

سردارنی کے مرنے کے بعد اُن بڑی بڑی بیٹھکوں میں کتنی بے رونقی ہوتی تھی۔ سردار مہر سنگھ اکثر شہر آتا جاتا رہتا وہ اپنی زمین بیچ کر وزن کھڑے والوں کے خلاف نئے سرے سے مقدمہ دائر کر رہا تھا۔ اس کی گھوڑی بڑے شہر سے لالڑاں آتی رہتی اور پھر واپس۔ پرانے دنوں کی طرح اب اس کے ساتھ چمار نہ دوڑتے۔ وہ باگیں ڈھیلی چھوڑے گھوڑی پہ بیٹھا رہتا اور سوچتا رہتا اس کی مونچھیں بھی داڑھی کے ساتھ ملی ہوئی نیچے ڈھلکی رہتیں اور پگڑی کے پیچ بہت بے ترتیب ہوتے۔ مجھے اُس گلی میں جاتے ہول آتا تھا۔ جہاں پہ کبھی مہریاں کہاریاں جھپ جھپ کرتی اندر جاتی اور باہر آتی تھیں۔ اور دروازے کے سامنے اناجوں سے بھرے گڈے آتے رہتے تھے کام کرنے والے، اناج اتارنے والے، بوریاں بھرنے والے، وہاں پھاٹک کے سامنے پیپل پہ صرف پتے شور کیا کرتے۔ جوگندر سنگھ کسی سرکاری عہدے پہ تھا اور پھر لوں بھی ماں کے مرنے کے بعد اُس نے کبھی لالڑاں کا رُخ نہ کیا۔ بند کھڑکیاں گرد سے اٹی ہوتیں جیسے انہیں مدتوں سے کھولا نہ گیا ہو اور باہر کی دیواروں پہ کائی نہ جانے کیوں خود بخود جمنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری دیوار سبز ہو گئی۔

مہر سنگھ گاؤں آتا تو سرکاری کاغذوں پہ جھکا رہتا اور اپنے منشی سے حساب کتاب کرواتا۔ اس نے کافی زمین بیچ دی تھی۔ کبھی کبھار گاؤں میں کوئی جھگڑا ہو جاتا تو لوگوں کو کئی کئی دن مہر سنگھ کا

انتظار کرنا پڑتا۔ وہ گاؤں کا سرتو پنچ تھا اور اہم فیصلے اس کے بنا ہو نہیں سکتے تھے۔ اس نے سرکاری سفید پوشی سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا۔ چوپال میں جب سردیوں کی اداس شاموں کو سب اکٹھے ہوتے تو اس مقدمے کا ہی ذکر کرتے جو لالہ لال والوں نے وزن کھیڑے والوں پہ کیا تھا۔ مہر سنگھ سے کوئی پوچھتا "سناؤ سردار جی کیا چال ہے مقدمے کی ؟" تو وہ پہلے دنوں کی طرح اکڑ کر یہ نہ کہتا "رب چاہے فتح تو اپنی ہو گی" اور سینے پہ ہاتھ مار کر یہ جواب نہ دیتا "ہم تو دشمنوں کا بیج یہ یاد کریں گے" شاید اب اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ بیج یہ یاد کرنے پہ کوئی حکم نہیں رکھتا اور فتح تو واہگرو کے اختیار میں ہے جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے۔

جنتی کبھی گاؤں آتی تو یہ نہیں اس اجڑی حویلی میں بھی جاتی جہاں مہر سنگھ کی ایک بیوہ بہن رہتی تھی اور جسے آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ برساتوں میں اب بھی اناج کو بڑے آنگن کے پکے فرش پہ دھوپ دی جاتی۔ اور مہریاں کہاریاں چاول پھٹکتی سردار کی بہن سے مقدمے اور وزن کھیڑے والوں کی باتیں کرتی رہتیں۔

جنتی کو دیکھ کر دیبو کی گو اکہتی" ادھر آ جنتی میرے قریب آ میں تجھے غور سے دیکھوں تو میری دیبو کی سہیلی تھی نا ؟ مجھے تجھ سے اس کی باس آتی ہے تو بیاہ میں نہیں آئی تھی نا۔ پر وہ آخری گھڑی تک تجھے یاد کرتی رہی تھی۔ مجھے ہوے سے کہنے لگی "ماں لو کبھی کو بھیج تو سہی۔

چنتی مجھ سے ایسی غصّے بھی تو نہ تھی کہ آتی ہی نہ۔"

میں نے کہا "بیٹی اس کی دادی بہت بیمار ہے مرنے کے کنارے ہے وہ کس طرح آئے گی۔"

اور دیپو نے کہا "اچھا وہ اگر ملے تو میرا یہ سری اکال کہہ دینا اور کہنا چنتی! دیپو آخری گھڑی تک تیرا انتظار کرتی رہی تھی۔"

میں نے کہا "ہائے کڑیئے کیا مت ماری گئی ہے بھلا تیری سُکھ سے واپس آئے گی تو سہیلیوں سے ملنا۔ پر ہائے چنتی تجھے کیا پتہ تھا۔ وہ تجھے آخری سلام دے رہی تھی۔"

پھر دونوں رونے لگتیں بُوا جس کی آنکھیں آگے ہی کمزور تھیں۔ اتنا روتی کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ اور چادل پھٹکتی کہاریاں بھی آکر پاس بیٹھ جاتیں اور ساری اپنے پلوؤں سے آنسو خشک کرتیں اور دیپو کو یاد کر کے روتی رہتیں۔

بُوا پھر کہتی "سردارنی بھابی کوئی مرنے والی تھی بس دیپو کا دکھ لے ڈوبا۔ قسم کھالی تھی اس نے تو۔ کیوں چنتی بھلا اس طرح قسم کھانے سے کوئی دیپو واپس آنے والی تھی۔ میں نے بہت بہت کہا "بھابی اس طرح اچھا نہیں ہوتا۔ پر وہ گیانی جی کے کہنے کے باوجود بھی زمین پہ سویا کرتی۔

"سردیوں کی کتنی ڈراؤنی رات تھی۔ جب باہر آنگن میں اس درخت کے نیچے سوئی تھی وہ۔ ہم سب اندر تھے ویہڑ بیٹھک میں تھا۔

ہائے" وہ ہاتھ مل کر کہتی "پتہ نہیں وہ سانپ کہاں سے آ گیا تھا"۔
اور کہاریاں یک زبان ہو کر کہتیں "وہ سانپ تھوڑا تھا موت کا دوت تھا"
پھر بُوا اپنی آنکھیں پونچھتی رونی اور کہتی "ڈس کے بھی پاس ہی بیٹھا رہا۔ سویرے سے جوگندر سنگھ نے اُسے اپنے ہاتھ سے مار دیا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ بس مرنے ہی آیا ہو۔ ذرا بھی تو نہ ہلا۔ پہلے کبھی نہیں سنا کہ سردیوں میں بھی سانپ نکلتے ہیں"۔
اور کہاریوں میں سے ایک کہتی "بھاگتا کس طرح مارے سردی کے جم گیا ہو گا"۔
کوئی جوان اور ذرا نک سِک سے درست ٹھہری یاد کراتی۔ "بھاؤ جو جوگندر سنگھ نے مارا تو اس کے سر میں سے خون کی ایک دھار نکلی تھی"۔ پھر سانپوں میں خون ہونے پر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتیں۔
تو وہ کہاری پھر کہتی "یہ درخت بھی تو کٹوانے لگا تھا بھاؤ جوگندر سنگھ"۔
بُوا کہتی۔
"ہاں جینتی یہ درخت بھی تو کٹوانے لگا تھا جوگندر سنگھ، پر میں نے کہا دیہ جو ہونا تھا سو ہو چکا رُکھ نہیں کاٹتے۔ بہت منتوں سے اُسے روکا۔ وہ تو اس درخت کے ساتھ سر مارتا تھا اور

کہتا تھا "میری ماں کو بس اسی درخت نے لیا ہے۔ اور کوئی آنے کا راستہ نہ تھا۔ سانپ کہیں سویا ہوا ہوگا اس نے باہر نکل آیا"۔

اور چنتی خاموشی سے ان دنوں کو یاد کر کے بہت دکھی ہوتی جب وہ دیپو سے بولا نہیں کرتی تھی اور میرے پر جو ایک بار دل کھٹا ہوا تھا تو بس اس نے کبھی دیپو سے اچھی طرح صلح ہی نہ کی۔

بوا کہتی "۔ اس کا دل تو سارا وقت تیرے میں پڑا رہتا چنتی۔ کسی اور سہیلی سے کبھی ملنے نہ گئی۔ پہ دوسرے چوتھے دن کہتی "ماں جی میں ذرا چنت کور کو مل آؤں"۔ آتنا پیار تھا اُسے تم سے، بیاہ والے دن تک یاد کرتی رہی۔ ہائے کس قدر روپ چڑھا تھا اُسے"۔ اور پھر چنتی سے بیاہ کی باتیں، جوڑوں کی، جہیز کی، ان گایوں بھینسوں کی جو اُسے دی گئی تھیں۔ اُس چرخے کی جس میں سونے کے کیل جڑے تھے۔ ساری کہانی پھر سے دہرائی جاتی۔ اور موٹر کا ذکر آتے ہی بوا حاکم سنگھ کو اور روزن کھیڑے والوں کو بد دعائیں دینے لگتی۔ اور کنگنوں کی اس جوڑی کی بات کرتے کرتے تو بیہوش ہونے لگتی۔ جس میں ہیرے تھے اور وہ کنٹھا جو آتنا بھاری تھا اور سورج کی طرح چمکتا تھا۔

چنتی گھر آتی تو بہت اداس ہوتی۔ منہ ڈھانپ کر روتی رہتی — جب تک اس کا بچہ رونے نہ لگے۔

سروپ کور کہتی "بہن جی صبر کرو۔ کوئی سہیلی کے مرنے پر اتنا رو رو کر جی ہلکان نہیں کرتا اور دونوں بیٹھ کر اس

آخری اور پہلی سہاگ رات کی باتیں کرنے لگتیں جو سروپ نے ایک ایک لفظ کر کے اپنے دل میں سمار کھی تھیں۔ اگر میں گھر میں ہوتا تو اٹھ کر باہر چلا جاتا۔

اس گھور اندھیارے کا کسی کو کیا پتہ تھا جو میری آتما کو ایک لمحے کو بھی روشنی میں آنے نہیں دیتا تھا۔ دیپو کے بعد مجھے رب اور واہگرو، گرنتھ اور گوردوارے کسی پر بھی یقین نہ رہا۔ پر جب وہ یاد آتی تو آتی ہی جاتی۔ اس کی ایک ایک بات، اس کی ہر ہر ادا، اس کی پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر وہ سندرتا جو بس اُمی کے حصّے میں آئی تھی۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتا کیا اس میں کسی طرح بدلے کا خیال اور بدی کرنے کا کوئی وچار تھا۔ پر مجھے کبھی ایسی بات اپنے اندر سے سنائی نہ دی۔

وہ نہ تھی پر سورج نکلتا تھا، پوہ کی راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ درختوں کی ننگی شاخیں آندھیوں میں اپنے ہاتھ سینے پر مار مار کر ماتم کرتی رہیں اور پھر خاموش ہو گئیں۔ ٹہنیاں نئے پتوں سے بھر گئیں۔ کونپلیں پھوٹیں۔ آموں میں بور آگیا۔ کوئل کُو ہو کُو ہو کرتی ہے پر میں پوچھتا ہوں وہ اب کسے پکارتی ہے؟

میرا دل لالڑاں میں نہیں لگتا۔ میرا دل کہیں بھی نہیں لگتا تھا۔

انسان اپنی ساری قوتوں کے ساتھ کسی عورت کو صرف ایک بار چاہ سکتا ہے وہ چاہت جس میں بھوک نہیں تسلی تھی۔ وہ چاہت جس میں دو دھارے اپنی اپنی جگہ رہے پر جن کا منبع ایک ہی چشمہ تھا۔ اگر دیپو زندہ

رہتی تو شاید ہم راہ بھول جاتے، بھٹک جاتے۔ اب وہ نہیں ہے اور پوہ کی راتوں میں پانی لگا کر گانا نہیں سوجا کرتا تھا وہ تھی بھی کہ نہیں۔ وہ میرا ایک خیال تو نہ تھی۔ اور پھر آکاش پہ آنکھیں جھپکاتے تارے اور چاند کے نیچے سے تیزی سے گزرتے بادل اندھیری رات میں سرن سرن بہتی ہوا اور دور کسی کونج کا اپنی ڈار سے بچھڑ کر پیچھے رہ جانے کے بعد بولنا، سب مجھے اس کی یاد دلاتا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کا نام میرے نام کے ساتھ لے۔ کوئی اس کی اونچائی اور میری نیت میں شک کرے۔ کوئی میری اداسی سے ہی یہ پتہ لگائے کہ شاید مجھے دیپو کے ساتھ کوئی لگاؤ تھا۔ اس لیے میں ان دنوں چوپال میں بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ قہقہے لگاتا۔ جو میری طرح جوان تھے اور جن پہ سے دکھ سکھ گھڑے پہ بارش کی بوند کی طرح پھسل جاتے تھے ہم آگ سینکتے، شراب پیتے اور کھیتوں کے گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کنواری مٹیاروں کے گیت گاتے جو کہانیوں کی طرح بس صرف سننے کے لیے تھیں اور جن کے چہرے کے چرچے ہم تک باپ دادا نے پہنچائے تھے، لوگ کہتے، دیکھو بھئی دلدار سنگھ کے ہاتھ پاؤں دادی کے مرنے کے بعد کھلے ہیں۔ یہ تو اپنی دادی کا لاڈلا ہمیشہ اس کی گود میں ہی گھسا رہتا تھا۔ میلوں پہ جاتے تو کندھوں پہ لاٹھی رکھے اس پہ دونوں باہیں لٹکا کر اپنی پگڑی ذرا ماتھے کی طرف جھکا کر باندھتے۔ ریشمی لاچے کے لڑ لٹکاتے تو میں شور کرنے میں سب سے آگے آگے ہوتا۔ ناچنے، جھگڑا ڈالنے اور مٹیاروں

کو آنکھیں مارتے ہیں میرا کوئی جواب نہ تھا۔

کیا میں دیپو کو بھلا رہا تھا؟

پر کیا میں اُسے بھلا سکتا تھا؟ کیا میں اُسے بھلا سکا ہوں؟؟

ساون جو آیا ہے تو اکھٹی سات دن کی جھڑی لگ گئی۔ کھیت پانی میں ڈوب گئے۔ لالڑاں کی گلیوں میں تو چلنا ہی مشکل تھا۔ دیواروں کا سہارا لے لے کر، کنکروں پہ پاؤں رکھ رکھ کر کہیں ہاٹ تک جاتے۔ کھوہ بند تھے اور ڈھور ڈنگر گیلے تھانوں پہ کھڑے کھڑے بیمار ہونے لگے تھے۔

پہلے دو دنوں میں گاؤں کی ملیاریں خوش ہوتی رہیں۔ چنتی کی سہیلیاں تو سب بیاہ کر اپنے اپنے سسرال جا چکی تھیں۔ نئی جوان ہوتی لڑکیاں جو ہمیں ماما اور چاچا کہتی تھیں۔ پینگیں ڈال کر جھولنے آئیں، پھر رات دن کالے بادل سیاہ دھوئیں کی طرح گھوم گھوم کر گول گول ہو کر نیچے نیچے جھکتے اور برکھا نے لالڑاں والوں کو ڈرا ہی دیا۔ کچے مکان گرنے لگے۔ باہر کی حویلیاں ڈھے گئیں، چھتیں گر گئیں۔ سب لوگ رب رب کرتے بچاؤ کی فکر میں تھے۔

بلونت کچھ بیمار ہی تھا اور ہمارے گاؤں کے حکیم جی اپنے گھر سکھتے کھیڑے چلے گئے تھے۔ مینہ کے دنوں میں اُسے سونف کا پانی ابال کر دیتے رہے۔ پر جس دن ذرا سا سورج نے سر باہر نکالا ہے۔ سُرد پ میرے پیچھے پڑ گئی۔

"دلدار سنگھ ذرا سکھتے کھیڑے جا۔ بچہ بیمار ہے سات

دن ہو گئے ہیں آخر اور لوگ بھی تو چلنے پھرنے لگے ہوں گے نا ؟
ساون کا پانی ہے سورج نکلا تو خشک، تم نہر کی پٹڑی پٹڑی ہو کر
چلے جاؤ، چار میل کا چکر تو پڑے گا پہ بچے کا دھیان کون کرے"؟
دوپہر کا چلا سکھتے کھیڑے پہنچا ہوں تو دن تقریباً اندر باہر تھا۔
حکیم جی نے بچے کا حال سنا دوا بنا کر دی۔ اور پھر یونہی جل پانی پلاتے
گاؤں کا اور ساون کی اس ایسی جھڑی کا ذکر کرتے رہے جو تیس سال
بعد لگی تھی۔ شام مجھے سکھتے کھیڑے میں ہی پڑ گئی۔
باہر نکلا ہوں تو نہر کی پٹڑی تک آتے آتے سورج چھپ گیا۔ یہ
سپاری ونڈ سے دوسری طرف کا راستہ تھا۔ اس لیئے چوروں ڈاکوؤں کا
ڈر مجھے نہ تھا پھر چھوی میرے پاس تھی جس کو میں نے نکال کر حفاظت
کے طور پہ اپنے آگے رکھ لیا۔ گھوڑی ان راہوں سے واقف تھی۔ پٹڑی
پٹڑی بھاگنے لگی۔ نہر کا پانی کبھی کبھی چمکتا اور تاروں کے عکس کے باوجود
بہت سیاہ لگتا تھا۔ بارش کا پانی ہوا کے فراٹوں سے کھیتوں میں بہتا تھا
جیسے دریا ہو اور بھیگی ہوئی ہوا میرے منہ پہ آ کر لگتی اور ساتھی کے کھیتوں
پہ سے ہوا ایک مدہم سی باس لاتی تھی۔ اگر دن ہوتا تو دریا
اور نہر کے بیچوں بیچ چلنا بہت اچھا لگتا۔ مگر مجھے بلونت کی بھی فکر
تھی اور اپنی جان کی بھی۔
چرخڑی والا پل آیا ہے جہاں سے دوسری طرف بھی راستہ جاتا
ہے تو میں نے رفتار ہولے کر لی اب لالڑاں کوٹی تین کوس ہی تھا۔ گھوڑی آہستہ

چلنے لگی۔ اور میں پھر ان یادوں کے دھارے میں بہہ گیا جو یادیں میرے لئے کبھی پرانی نہ ہوں گی۔ اور پہلی بار میرے دل میں شک نے سر اٹھایا۔

"ہو سکتا ہے دیپو کا تعلق شہر میں کسی کے ساتھ ہو، ہو سکتا ہے۔۔۔؟"

مگر دوسری گھڑی ہی دل نے مجھے ملامت کی "کیا تم نے اس بات پہ صبر نہیں کیا۔ کہ وہ تمہیں اور صرف تمہیں چاہتی تھی کم ظرف، کیا تم نے اس کی آنکھوں میں کبھی دھوکا اور کھوٹ دیکھا تھا؟ کیا تمہیں اس کی باتوں میں یہ آواز نہیں سنائی دی کہ وہ بس تمہاری تھی۔ اس نے تم پہ سے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اس اس کے لئے اس عزت کے لئے جو ایک بار ہی عورت کی روح میں سر اٹھاتی ہے اس نے اندھیرے میں تمہارے سپنے دیکھے اجالے میں تمہارا خیال رکھا۔ اور پھر تم یہ کہتے ہو؟"

اپنے پیچھے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ گھوم کر میں نے کہا "کون ہے؟" اور چھوی کو سر سے بلند کر لیا۔

آنے والے نے کہا "دلدار سنگھ! بھئی ست سری اکال!"

"ست سری اکال سردار"۔ میں نے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا "تم اس طرح کیوں آ رہے ہو کہ گھوڑی کی باگیں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ کیا بات ہے؟"

ہرسنگھ بولا "یار پتہ نہیں کیا ہوا ہے اسے بس راہ میں اڑ اڑ جاتی ہے اچھلتی ہے اور مجھے مارنے کی کوشش کرتی ہے چڑھتا

ہوں تو اُلٹے قدموں شہر کو لوٹنے لگتی ہے میں نے سپاری ڈنڈ کے پاس اُسے مارا بھی ہے پر یہ ایک قدم نہیں چلتی - اب میں اسے چلاتا لایا ہوں - سفید گھوڑی دیکھی تو میں نے سوچا سوائے دلدار سنگھ کے اور کون ہو سکتا ہے - بھئی تم اس وقت کہاں سے آئے ہو ؟"

میں نے سکھتے کھیڑے جانے اور حکیم صاحب سے ملنے کا سارا قصہ سنایا -

سردار تھوڑی دیر خاموش رہا اور بولا " جوانی بھی کیا ہوتی ہے گزر گئی تو پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ذرا ذرا سی باتوں پہ یونہی خون گرم کر لیتے تھے - اب یہ گھوڑی ہی لو - الوپ سنگھ کی اور میری دوستی اس کے لئے ختم ہوئی تھی - یہ مہاراجہ نابھہ کی گھوڑی کا بچہ تھا ان دنوں جس شخص کے پاس یہ تھی اس سے ہم دونوں الگ الگ ملے تھے الوپ سنگھ بھی گھوڑیوں کا دیوانہ تھا اور مجھے بھی گھوڑے پالنے کا عشق تھا - اس نے کہا یوں نہیں - تم دونوں بولی دو جس نے بڑھ کر بولی دی ——————— وہی لے لے - ہم دونوں میں بڑا پیار تھا - بہت ہی پیار، ان دنوں سردارنی کرتار کور مجھے بہت برا بھلا کہا کرتی تھی کہ میں الوپ سنگھ کو لئے پھرتا ہوں - اور برباد کر رہا ہوں - پر اب تو کوئی بھی نہیں رہا - نہ وہ جس کے بدلے وہ مجھے برا کہا کرتی تھی اور نہ خود کہنے والی "

پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "انوپ اور میں دونوں گھوڑی کا بچہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور ایک دوسرے کے سامنے بھی نہیں آنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کسی دوسرے آدمی سے بولی دلوائی اور اس نے بھی، مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ اتنی زیادہ قیمت لگائے گا اس کی۔ میرا آدمی تو دس ہزار پہ پہنچ کر ختم کر گیا پر اس کا بھیجا ہوا آدمی بڑھتا رہا اور سودا پندرہ ہزار پہ ختم ہو گیا۔ انوپ سنگھ نے اپنی زمین بیچ دی اور یہ گھوڑی خرید لی۔"

سردار نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ بہت اداس لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"اور پھر انوپ سنگھ کے لئے میرے دل میں گرہ پڑ گئی۔ نہ وہ کبھی میرے ساتھ شکار پہ جاتا اور نہ ہی میں اس کے ساتھ۔ میں نے اس سے گھٹیا نسل کی گھوڑیاں خرید کر ان سے اپنا گھر بھر لیا۔ اور لوگ مجھے ہر سنگھ سفید گھوڑیوں والا کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے ہم چوپال میں ملتے تو ہمارے درمیان بس سست سری اکال ہی ہوتا۔ پھر لوگوں نے مجھے اس کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ اگر اُتم سنگھ اُسے نہ مارتا اور یہ بھاگو کا قصہ نہ ہوتا تو میں اُسے خود مار دیتا ان دنوں اُتم سنگھ جوان تھا۔ جب وہ ضمانت پہ رہا ہو کر آیا ہے تو میں نے اُسے کہلا بھیجا تھا کہ بیس ہزار میں یہ گھوڑی مجھے دے دے مگر اس نے کہا تھا "باپر کے وچن کا پالن کروں گا

ویسے گھوڑی آپ کی ہے جب چڑھنے کو جی چاہے منگوالیا کریں۔"

"اور پھر تم جانتے ہو میں نے دو مربعے بیچ دیئے خود ولایت جاکر رام سنگھ کی پھانسی کا حکم لایا تھا۔ اس گھوڑی نے سدا مجھے یہ یاد دلایا ہے کہ میں انوپ سنگھ سے ہار گیا ہوں۔ اور میں نے ہار کو ہر طریقے سے جیت میں بدلنا چاہا ہے۔ اس گھوڑی کے ساتھ میری ساری دوستیاں اور دشمنیاں ہیں اس گھوڑی کے ٹاپوں کی آواز تو میں شاید مرنے کے بعد بھی سنتا رہوں گا۔"

مجھے لگا جیسے سردار کی آواز میں آنسو ہوں۔ میں نے پرانی یادوں سے دھیان ہٹانے کے لئے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

"کیوں سردار وزن کھیڑے والے مقدمے کا کیا بنا؟"

سردار نے کہا "جس دن سردارنی مری ہے اور میں مورتی والے چبوترے پر بیٹھا تھا اس گھڑی مجھے لگتا تھا نہ کسی دوستی میں کچھ ہے اور نہ دشمنی میں۔ اب دیکھو انوپ سنگھ نہیں ہے اُسے کیا کہ میں نے اس کے رام سنگھ کو پھانسی لگوایا تھا یا نہیں۔ اور اگر میں بھی مرجاتا تو کیا پتہ چل سکتا تھا مجھے کہ دیپو کو مارنے والے نے پھانسی پائی ہے کہ نہیں۔ موت سارے اونچے نیچے برابر اور آگ سارے اچھے برے کو پوتر کر دیتی ہے دلدار سنگھ۔ پر تو نے مجھے کہا تھا کہ میں اس پرانی ڈگر کو نہ چھوڑوں اور ٹھیک ہے پرانی ڈگر کو کیوں چھوڑوں میں۔ اپنی ہار کو سدا دولت لگا کر جیت میں بدلتا رہا

ہوں۔ اب وزن کھیڑے والوں سے کیوں ہار مان کر مروں۔ اور یہی سوچ کر میں تمہارے ساتھ شہر چلا گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے جب جوانی نہیں رہی جب زور نہیں رہا جب امیدیں نہیں رہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لئے وزن کھیڑے والوں کو ہرا کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ مگر پرانے راستے کو کیوں چھوڑ دوں۔ کیوں دلدار سنگھ؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سردار۔ ٹھیک ہے۔ یہ ڈگر ہمارے خون کا راستہ ہے دادی نے کہا تھا۔ نہ کوئی گناہ گار ہوتا ہے اور نہ کوئی بے گناہ، بس یہ ریت ہے جو ہمارے باپ دادا کی طرح سے ہمیں ورثے میں ملی ہے۔"

سردار نے زور سے کہا "سردارنی کرتار کور سچی تھی اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ سب کچھ اس دیس کی ہوا میں ہے، ہمارے خون میں رچی سرخی میں ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں۔"

بڑی دیر تک ہم خاموش چلتے رہے اپنے اپنے خیالوں میں لپٹے۔

سردار پھر بولا "یہ ایک بات کا پتہ نہیں چلتا دلدار سنگھ! جس کا غم مجھے سدا رہے گا۔ موت کے بعد بھی کہ آخر وہ کون سورما تھا۔ جس نے میرے گھر میں چوری کی۔ دیپو کی بات سارے جگ میں مشہور ہو گئی اور آج تک پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کون تھا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا "حاکم سنگھ کی بات مجھے تو سچ ہی لگتی ہے دلدار سنگھ۔ دیپو نے ضرور اُسے کہا ہو گا۔ دیپو میری بیٹی تھی۔ سدا گھر سے باہر بیٹھکوں اور حویلیوں میں رہنے کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ اُسے جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ اس نے کبھی اُلٹی راہ پر چلنے کی کوشش نہیں کی۔ جب کبھی اس کی اور گوربخش کی لڑائی ہو گئی۔ اگر اس کا قصور ہوتا تو وہ مان لیتی۔ سچ اس کی رگ رگ میں خون کے ساتھ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب حاکم سنگھ کو پہلی بار ہی ایسے سچ سے واسطہ پڑا تھا اور پھر وہ دریا دل بھی نہ تھا اگر اُسے دیپو کا ذرہ برابر بھی پتہ ہوتا تو وہ اس سے کبھی یہ سلوک نہ کرتا۔"

سردار کی آواز بھرّا گئی۔ "پتہ نہیں کون تھا، وہ کون سورما تھا۔ کس ماں کا پوت تھا اگر مجھے اُس کا پتہ چل جائے تو کم از کم جو سچ دیپو ـــــ حاکم سنگھ کو نہ بتا سکی میں اس سے پوچھ لیتا۔"

میں نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی۔ اور کھڑا ہو گیا۔ سردار بھی میرے برابر رُک گیا اور بولا۔

"کیوں بھئی دلدار سنگھ کیا بات ہے۔ رک کیوں گئے ہو؟"

دو کوس پرے کسی کھوہ پر چھوٹے سے کوٹھے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ راہ کے اِدھر اُدھر پانی اور لہروں کا پتہ ڈوبتے

ستاروں کے عکس کو دیکھ کر چلتا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

سردار نے پوچھا "دلدار سنگھ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "سردار اس گھڑی اس راہ پہ تم اور میں دونوں ہیں اور یہ گھوڑیاں ہیں جن کی آنکھوں میں ہمارے سارے لاڑاں کی بیتی زندگی کی کہانیاں ہیں رات اندھیری ہے اوپر آکاش ہے جس سے پرے کسی شے کے ہونے اور نہ ہونے پہ مجھے وشواس نہیں۔ صرف ایک بات کا جواب دوں گا جو تم نے پوچھی ہے چاہے، تم اسے سچ مانو، چاہے جھوٹ؟"

سردار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے سامنے کھڑے اس کے بدن میں ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ سیدھا ہو رہا ہو۔ اور اتنے سالوں کو اپنے کندھوں سے جھاڑ کر اسی جوانی کے گرم خون کو اپنی رگوں میں محسوس کر رہا ہو۔

میں نے پھر کہا "کیوں سردار کہوں؟"

اس نے کہا "نہیں صرف یہ بتاؤ تم اس کے کیا تھے؟ اور کچھ نہیں ایک لفظ نہیں"

میں نے کہا "میرے ہاتھ میں چھوی ہے۔ یہ میری آن ہے اور میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں سردار۔۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا "نہیں کوئی اور قسم اٹھاؤ۔

آن کا جادو جھوٹ ہے"۔

اور میں نے اس اندھیری مگر ستاروں بھری رات میں جب آکاش پہ میرے لئے کچھ نہ تھا اُسے کہا، مجھے چنتی کی اپنی بہن کی قسم میرا دیپو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جب بیاہ کر گئی ہے تو میرے لئے اتنی ہی پوتر تھی جیسے چنتی"۔

سردار وہیں بیٹھ گیا۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر اس نے اپنے گھٹنوں پہ ہاتھ مار کر کہا "اوہ میری بھولی دیپو! میری بھولی دیپو!!"

اور پھر ہم لالڑاں تک چپ چاپ چلتے آئے۔ پانی میں گھوڑیاں چھپ چھپ چل رہی تھیں میں تہمند کو اوپر کئے آگے آگے چلتا سردار کو راہ بتاتا جاتا تھا۔

دوسرے دن سویرے سویرے ہل چھوڑ کر لوگ لالڑاں میں بھاگے آئے۔ سردار مہر سنگھ کی گھوڑی نے سپاری ونڈ کے قریب غصّے میں آکر سردار کو کیسوں سے پکڑ کر نیچے گرا لیا تھا۔ اور پھر اس کی گردن کو جھٹکے دیتی رہی یہاں تک کہ سردار مر گیا۔

اور اس دن دوپہر کو سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق حاکم سنگھ کو جو وزن کھیڑے کا لڑکا اور لالڑاں والوں کا داماد تھا پھانسی کی سزا ہو گئی۔ سردار نے مرتے دم تک جس ڈگر پہ چلنے کا جو ارادہ کیا تھا اُسے پورا کیا۔

بلونت یہاں ہے اور میں بھی اس کے ساتھ ہوں لالڑاں شہروں کے اس شور اور سندرتا میں اس نئے پن میں ایک قصہ کہانی لگتا ہے گاؤں سے کبھی کوئی آتا ہے تو کہتا ہے کہ سردار مہر سنگھ کی حویلی میں اُلّو بولتے ہیں۔ چھتیں گر گئی ہیں۔ بڑے دروازے میں پیپل اُگ آئے ہیں۔ اور پچھواڑے کا باغ جس میں کبھی سو طرح کے پھل لگتے تھے، جنگل لگتا ہے۔

اور اس سرد رات میں جب بلونت اور اجیت کور ابھی باہر سے واپس نہیں آئے۔ سرد ہوا ٹوٹے شیشے میں سے آکر میرے منہ پہ لگتی ہے اور مجھے پوہ کی وہ راتیں یاد آتی ہیں وہ راتیں جو زندگی تھیں جوانی گزر گئی تو پتہ چلتا ہے۔ پہ اب پتہ چلنے سے کیا فائدہ؟

پور کا ایلی (ناول)

نصف صدی کی داستان

امت سائز قیمت

۱۲ صفحات ۳۰×۳۶/۸ ۲۰ روپے

ستان گو — ۷۲ دی مال — لاہور